www.KitaboSunnnat.com

اسلامی مملکت و حکومت

کے

بنیادی اصول

تصنیف :۔ محمد اسد (لیوپولڈ وائس)

ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر

تقدیم وتحشیہ :۔ امجد علی شاکر

1

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

اسلامی مملکت و حکومت

کے

بنیادی اصول

تصنیف :۔ محمد اسد (لیوپولڈ وائس)

ترجمہ :۔ مولانا غلام رسول مہر

تقدیم و تحشیہ :۔ امجد علی شاکر

www.KitaboSunnat.com

متصل مسجد پاکستان ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور فون : ۲-۵۴۲۷۹۰۱-۰۴۲
E-Mail: juipak@wol.net.pk

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Islami Mumlikat o Hakoomat ke Buniadi Asool
By
Mohammad Asad
ISBN NO: 969-8793-58-5

259
1-م2ا

ضابطہ

نام کتاب	اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول
اشاعت جدید	ستمبر ۲۰۰۹ء
ناشر	محمد ریاض درانی
کمپوزنگ	جمیلہ کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس لاہور
قیمت	110/- روپے
بہ اہتمام	محمد طلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

المکتبۃ العمانیۃ
۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر.....15822.....

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

☆ عرضِ ناشر		۵
☆ توضیحات وتنقیدات		۷
☆ پیش لفظ		۳۵
☆ دیباچہ		۳۹
پہلا باب:	پیش نظر مسئلہ	۴۳
دوسرا باب:	مصطلحات اور تاریخی نمونہ	۶۰
تیسرا باب:	حکومت بہ رضائے عوام ومجلس شوریٰ	۷۳
چوتھا باب:	حاکمہ اور مقننہ کے درمیان روابط	۹۶
پانچواں باب:	شہری اور حکومت	۱۱۷
چھٹا باب:	مباحث کا ماحصل	۱۳۵

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرضِ ناشر

پاکستان میں اس کے قیام کے ساتھ ہی یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر گیا کہ پاکستان میں کس قسم کا نظام نافذ ہونا چاہیے۔ مختلف ادوار میں مختلف ادارے وجود میں آئے جو ہمارے اربابِ اقتدار کو یہ مشورہ دے سکیں کہ ہمارے ملک کا نظام کس طرح اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حمید اللہ اور محمد اسد بھی مختلف ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔
ڈاکٹر حمید اللہ جلد ہی یہ بات جان گئے کہ ہمارے حکمرانوں کا مقصد نظامِ حکومت کو بدلنا نہیں، عوام کو خوش رکھنے کے لیے محض کاغذی کارروائی کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے معاشی ماہرین کے بارے میں کہا تھا:

تری کتابوں میں رکھا ہی کیا ہے اے حکیم معاش آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش، مریز کجدار کی نمائش

یہ بات حرف بہ حرف ہمارے حکمرانوں پر بھی صادق آتی ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل قسم کے ناموں کے ادارے تو بناتے ہیں، مگر اسلام سے گریزپا رہتے ہیں۔
محمد اسد بھی حکومت کو مشورہ دینے آئے تھے کہ نظامِ حکمرانی کو کیسے اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، مگر وہ بھی سمجھ گئے کہ یہاں مشورے کا عمل یک طرفہ ہے۔ انھوں نے اپنے مشوروں کو کتابی صورت میں پیش کر دیا جو پاکستان اور امریکا سے شائع ہوتی رہی۔ زیرِ نظر کتاب اسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ مصنف نومسلم ہیں۔ انھوں نے نہایت کاوش سے عربی زبان وادب اور علومِ اسلامی کا علم حاصل کیا۔ انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بھی کیا اور اس پر نوٹس بھی لکھے۔
محمد اسد نومسلم ہیں۔ پھر باقاعدہ کسی شیخ کے تربیت یافتہ بھی نہیں۔ اس لیے بعض مقامات پر ان کا ٹھوکر کھانے کا بہت امکان ہے۔ اس لیے اُن کے بعض تفسیری نتائج سے بھی اختلاف کیا گیا۔ اس کتاب میں بھی بعض مقامات ایسے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اُن کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض خیالات زیادہ وزن اور وقار نہیں رکھتے، مگر مجموعی طور پر ان کی کتاب ایک علمی کتاب ہے۔ ہم نے بعض تحفظات کے باوجود اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اہل علم اس سے مستفید ہوں۔ اس سے اختلاف کر سکیں اور بات آگے بڑھ سکے۔ پروفیسر امجد علی شاکر نے اس کتاب پر ایک طویل تجزیاتی مضمون رقم کیا ہے جسے بطور مقدمہ کے پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں بہت قابل قدر سوال اُٹھائے ہیں اور وہ بہت سے علمی نکات زیر بحث لائے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ اُمید ہے قارئین اس سے بیش از بیش استفادہ کریں گے۔ والسلام

محمد ریاض درانی
مسجد پائلٹ ہائی سکول
وحدت روڈ لاہور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توضیحات وتنقیدات

بیسویں صدی بھی کیا ہنگامہ خیز صدی تھی کہ مسلم دنیا میں سوالات کی یلغار ہوگئی۔ چاروں جانب سے سوالات سیل در سیل اُمڈ پڑے۔ ان سوالات کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا۔ یہ صدی مسلمانوں کی غلامی کو دیکھ کر طلوع ہوئی تھی۔ اس لیے ان سوالات کے پس منظر میں حکومت کرنے اور سیاسی عروج کے حصول کا جذبۂ محرکہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی سطح پر موجود تھا۔ اس جذبے کو پورے طور پر مسترد کرنا بھی ناممکن ہے۔ یہ انسانوں کا فطری جذبہ ہے، مگر اس جذبے کو جذباتیت کے انداز میں اپنانا اور عقل و ہوش کو مکمل مسترد کرنا ہر لحاظ سے نامناسب بھی ہے اور نادرست بھی۔

اُس زمانے کا سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کو زوال کیونکر آیا۔ اس سوال کو پیش کرتے ہوئے اور اس کا جواب دیتے ہوئے سیاسی عروج و زوال کو مدنظر رکھا گیا اور بقیہ تمام تہذیبی منظرنامے کو، جس میں علم، فکر، نظر، فنون، اقدار اور دیگر شعبے شامل ہیں، نظرانداز کر دیا گیا۔ اس یک رُخی سوچ نے ابتداء میں ہی غلط رُخ پر ڈال دیا۔ نتیجتاً اس سوال کے جتنے بھی جواب آئے، وہ اکثر یک رُخے، جذباتی اور کسی حد تک یا مکمل حد تک غلط تھے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے جوابات سکہ رائج الوقت ہوگئے۔ ان میں سے بہت سے سوالات اور جوابات تو ایسے کلیشے بن گئے جن سے اب تک پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا ہے۔

سوال بہت سیدھا سا تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی زوال کیوں کر ہوا؟ مگر اسے مکمل زوال سے تعبیر کیا گیا۔ گویا مسلمانوں کی تہذیب کا کمال بھی وہیں تک تھا جہاں تک سیاسی زوال کا آغاز نہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت مجدد الف ثانی اور اورنگ زیب عالمگیر تک مسلمانوں کا دورِ عروج ٹھہرا اور آگے زوال ہی زوال تھا۔ علامہ اقبال نے جب یہ شعر کہا تو اُن کے ذہن میں یہی پس منظر تھا:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تین سو سال سے ہند کے ہیں میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اس شعر کو اگر تاریخ مان لیا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت سید احمد شہید، علمائے فرنگی محل، علمائے خیرآباد اور علمائے دیو بند کے علمی اور فکری کارناموں پر خط تنسیخ کھنچ جاتا ہے۔

سوال ایک غلط مفروضے پر قائم ہو تو اُس مفروضے کی تردید کے بعد ہی درست جواب دیا جانا ممکن ہے۔ اب اگر سوال یہ کیا جاتا کہ مسلمانوں کو سیاسی زوال کیوں ہوا؟ تو اس کا جواب آسانی سے مل سکتا تھا۔ حضرت امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے مختلف طبقات سے خطابات میں اس سوال کا جواب موجود تھا۔ سیاسی قیادت کی ذمہ داری جن طبقات پر تھی وہ انھوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بجائے خود کو معاشرے پر بوجھ بنا دیا۔ وہ اپنے عہد کے تقاضوں کو نہ سمجھ سکے۔ ان کا وژن محدود تھا۔ اس لیے وہ اپنے سے برتر وژن رکھنے والے گروہ سے شکست کھا گئے۔

سوال سادہ سا تھا اور جواب بھی۔ اب اگر اس سادگی کو اپنایا جاتا تو کئی مسائل اور اُلجھنیں پیش ہی نہ آسکتی تھیں۔ اب اگر ایسا کیا جاتا تو بہت سے نقصانات کا خطرہ تھا۔ مثلاً پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ بات بہت سادہ رہ جاتی اور فلسفہ سازی اور نکتہ طرازی کا اچھا بھلا موقع ضائع ہو جاتا۔ دوسری بات یہ کہ حکمران طبقات نے تو نئے حکمرانوں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ مثلاً سلطان ٹیپو کے مقابلہ میں نظام نے انگریزوں سے سمجھوتا کر کے ٹیپو کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کی تھی۔ نظام پر تنقید میں تو کئی نقصانات مضمر تھے۔ اب اگر نوابوں اور جاگیرداروں کو زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تو کتنے ہی خطرے سامنے موجود تھے۔ وظائف لینے کے لیے تو انہی کے در دولت پر جبیں سائی کرنا پڑتی تھی۔ ان پر تنقید تو خاصی خوفناک ہو جاتی۔

لیجیے صاحب دانشور اصل راہ سے ہٹ کر اب فلسفہ سازی کی راہ پر چل نکلا تو رستے میں کیا کچھ حاصل ہوا، اس کی مختصر روداد بھی سن لیجیے۔ ہمارا دانشور جب اس سوال کا جواب ڈھونڈنے نکلا تو اُس کے ذہن میں عروج کا ایک خاص ماڈل تھا، وہ تھا یورپ کا موجودہ عروج۔ یورپ کے بھی مختلف ماڈل تھے۔ ایک ماڈل جرمن اور اٹلی کا تھا جہاں فاشزم تھا۔ ایک ماڈل برطانیہ کا تھا جہاں جمہوریت تھی۔ پھر یورپ میں ایک چیز مشترک بھی تھی، وہ تھی دنیا پرستی اور دنیاداری۔ پھر اُس کا ایک تاثر بھی تھا خصوصاً غلام ذہنوں پر، وہ تھا ملک وسلطنت کا شان وشکوہ۔ اب یہی چیزیں اسلام

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ڈھونڈنے کی سعی شروع ہوئی۔ علامہ مشرقی کو جرمنی اور اٹلی کا ماڈل پسند آیا۔ اُس نے اسلام میں آمریت ڈھونڈ نکالی۔ کچھ لوگوں کو جمہوریت پسند آئی، انہوں نے اسلام میں جمہوریت ثابت کرنا شروع کر دی۔ دنیا پرستی اور دنیاداری کے حوالے کو بھی اسلام میں ڈال دیا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے تصوف رستے کی دیوار بنا تو اسے غیر اسلامی ٹھہرایا گیا۔ ویسے بھی یہ شان وشکوہ کے رستے کی دیوار بنا تھا۔ اس لیے اس کے غیر اسلامی ہونے میں تو کوئی شک وشبہ باقی نہ رہا۔ اس ذہنی کیفیت میں یہ بات کس قدر متاثر کرتی ہے:

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عید محکوماں ہجومِ مومنیں

اسلام میں اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کے شان وشکوہ کی پوری گنجائش ہے، مگر اسلام صرف شان وشکوہ نہیں ہے۔ اسلام میں تصوف بھی ہے۔ اب ایک گروہ تصوف کو رد کرنے لگا۔ ایک گروہ نے آمریت کو اسلام ٹھہرایا تو ساتھ ہی فقہی اختلافات اور کلامی مباحث کو بھی مسترد کر دیا۔ تصوف، فقہ اور علم کلام میں عجمی مسلمانوں کی خدمات عرب سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ یہ عجم کا کارنامہ تھا، مگر یہ کارنامہ کارِ زیاں ٹھہرا دیا گیا اور تصوف، فقہ، علم کلام تینوں کو عجمی سازش قرار دیا گیا:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

فقہائے اسلام کے کارنامے، صوفیائے اُمت کے فکری اور عملی کارہائے نمایاں، متکلمین کی خدمات سب کچھ یک قلم مسترد کر دیا گیا۔ یہ رویہ بعد میں باقاعدہ ایک مکتبۂ فکر بن گیا۔ مسٹر پرویز عمر بھر عجمی اسلام کو مسترد کرتے رہے اور انگریزی اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ یہ اسلام پرویز صاحب کا تراشیدہ تھا جسے انھوں نے مغربی مفکرین سے لیا اور قرآن سے منتھی کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مفہوم القرآن کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تو یہ کتاب قرآن سے مختلف، بلکہ متضاد ہوگی۔

ان بحثوں سے ایک بات ثابت ہوگئی کہ تاریخ اسلام کے ایک دور میں کہیں غلطی ہوگئی تھی اور مسلمان اسلام کی بجائے کسی اور راہ پر چل نکلے تھے جو اسلام نہیں کچھ اور تھا۔ اس نتیجے نے ایک نئے مکتبِ فکر کو جنم دیا جس کا نظریہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مختلف ہے۔ دونوں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ بات ایک حد تک درست بھی تھی، مگر بات مکمل درست بھی نہ تھی کہ مسلمانوں کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک گروہ ہر دور میں اسلام کی دعوت لیے تاریخ کا سفر طے کرتا رہا۔ اسلام کی دعوت بغیر کسی تسلسل کے اب تک موجود ہے۔ اس دعوت کو پیش کرنے والوں کو ہم آئمۂ ہدایت کہہ سکتے ہیں۔ یہ آئمۂ ہدایت اپنے سے پہلوں کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہاں آئمۂ ضلالت ایک دوسرے کی تردید بھی کرتے ہیں اور آئمۂ ہدایت کی تردید بھی۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سوویت انقلاب نے فکری دنیاؤں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ مارکس نے ایک بات کہی تھی کہ نظریے کی پہلی Manifestation ریاست ہے اور اس کی پہلی Functioning قانون ہے۔ اس صورتِ حال میں اسلامی ریاست کا نظریہ سامنے آیا۔ اس کے نظریہ سازوں نے دعویٰ کیا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اسلام کا سیاسی نظام ہے اور ملوکیت اس کی نفی ہے۔ اس لیے خلافت راشدہ تک کے عہد کی تاریخ تو تاریخ اسلام ہے۔ ادھر خلافت راشدہ کا عہد ختم ہوا، اُدھر مسلمان بھٹک گئے۔ اب دین کے احیاء کی ضرورت ہے۔ ماضی میں دین کی تجدید کی کوششیں تو ہوتی رہی تھیں، احیا کی نہیں۔ تاریخ تجدید کا تجزیہ کیا گیا تو اسلامی ریاست کے ایک نظریہ ساز عالم نے تاریخ تجدید کو بھی مسترد کر دیا اور احیائے اسلام کی ایک تحریک برپا کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس نظریہ ساز عالم نے بعد میں جب یہ تجزیہ کیا کہ خلافت ملوکیت میں کیوں کر تبدیل ہوگئی تو انھوں نے حضرت عثمانؓ پر نقد و جرح سے بھی گریز نہ کیا۔ ان کی نقد و جرح کا خلاصہ یہ تھا کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوگئیں کہ خلافت آگے چل کر ملوکیت میں بدل گئی۔ ان کے ہاں صحابہ معیارِ حق نہ تھے۔ ان پر تنقید ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ان عالم کے متبعین ان پر بھی تنقید نہیں کرتے۔ عجیب بات ہے کہ یہ اصولی طور پر قرآن وحدیث کو واجب الاتباع مانتے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حدیث کا سارا ذخیرہ ہی الصحابہ کلہم عدول کے اصل پر مرتب ہوا ہے۔ اب اگر اس اصول کا انکار کر دیا جائے تو حدیث کا سارا ذخیرہ مشکوک ہو جائے گا۔ خلافت وملوکیت کا مذکورہ تجزیہ تاریخ اسلام میں منفرد تجزیہ تھا۔ یہ ایسا تجزیہ تھا جس نے تاریخ اسلام کو مجروح کر دیا اور اسلام کی عظمتوں پر شک کے سائے ڈال دیے۔ یہ تجزیہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ زیادتی تو ہے ہی، خود تاریخ کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔ پھر یہ صرف ایک تجزیہ نہ رہا۔ اسے تبلیغ کے انداز میں پیش کیا گیا اور یوں صحابہ پر نقد و جرح کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

یہ جتنے تجزیے تھے، ان سب کا حاصل یہ تھا کہ ہم جسے اسلام مانتے چلے آ رہے ہیں، یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام نہیں کچھ اور ہے۔ کسی نے اسے ملوک پرستانہ اسلام ٹھہرایا، کسی نے عجمی اسلام، کسی نے فرقہ وارانہ اسلام اور کسی نے جعلی اسلام۔ اب اصلی اسلام کیا تھا، وہ خود ان کے اپنے ذہن میں تھا یا قرآن سے درآمد ہوا تھا، اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ پھر اس سے اگلی بات یہ کہ اسلام کو نہ صوفیا سمجھ سکے نہ فقہاء، نہ متکلمین اور نہ محدثین۔ گویا اسلام اب تک ایک اسرار تھا جو ان پر کھلا اور اب بھی اس کو پیش کر سکتے ہیں، مگر ان کے ہاں جو کچھ برآمد ہوا اُس کے بارے میں سلیم احمد لکھتے ہیں:

''تلاش تھی خالص اسلام کی اور برآمد ہوئی مغربیت''۔(۱)

دراصل مسئلہ معیار کا تھا۔ معیار حق مغرب ہو تو اسلام سے مغربیت ہی برآمد کی جائے گی۔ مقصود سیاسی غلبہ ہو اور اس سیاسی غلبہ کے رائج الوقت اصولوں اور طریقوں کی پیروی کو ضروری ٹھہرایا جائے تو تصور اسلام گڑبڑ ہو کر رہ جاتا ہے۔ فرع اصل بن جاتی ہے اور اصل کو فرع کا درجہ مل جاتا ہے۔ سلیم احمد نے ان مختلف مباحث کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں اسباب زوال اُمت کی بحث سمیٹتے ہوئے خلاصہ یوں رقم کیا تھا:

''پہلے حکمران کی تحدید ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ زوال کا سبب یہ ہے کہ حکمران اسلام کی تعلیم کے برعکس عیش وعشرت اور رنگ رلیوں میں پڑ گئے تھے۔ چنانچہ زوال کے آغاز کی تاریخ اورنگ زیب کی وفات مقرر کی جاتی ہے۔ پھر حکمرانوں کے ساتھ عوام کے بگاڑ پر بھی غور وخوض شروع ہو جاتا ہے اور کہا جانے لگتا ہے کہ اس کی ابتدا عہد اکبری میں ہوئی۔ جب غیر اسلامی رسوم کثرت سے مسلمانوں میں داخل ہوئیں۔ اب غیر اسلامی اثرات کا جائزہ شروع ہو جاتا ہے اور جس طرح انگریزوں کی ترقی کا جو سبب سمجھا جاتا تھا، اُسے اسلام سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح زوال کا جو بھی سبب کسی کی سمجھ میں آیا، وہ اسے غیر اسلامی قرار دینے لگا۔ مثلاً کچھ لوگوں نے کہا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب بے عملی ہے اور بے عملی کے بارے میں تحقیق ہوئی کہ یہ تقدیر پرستی، قناعت اور توکل کے غلط تصورات سے پیدا ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ یہ عناصر پیدا ہوتے ہیں تصوف

۱۔ سلیم احمد، اسلامی نظام، صفحہ ۱۵۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے تصوف کو غیر اسلامی قرار دینا شروع کیا۔ پھر کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ مسلمان غیر ضروری بحث مباحثے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس کا سبب علم کلام ہے۔ اس لیے علم کلام کو غیر اسلامی کہا جانے لگا۔ اب تصوف اور کلام کے جائزے میں بات عہد اکبری سے عباسیہ عہد تک پہنچ گئی۔ لوگ کہنے لگے یہ عجمی سازش تھی جس نے اسلام جیسے عملی مذہب کو خیالی باتوں میں اُلجھا دیا۔ اسباب زوال اُمت کی یہ تحقیق یہاں رُکی نہیں۔ کچھ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کا زوال ہوا ہے جمود سے اور جمود پیدا ہوا ہے تقلید سے۔ اس طرح اسلامی فقہ کو بھی زوال اُمت کے اسباب میں شامل کر لیا گیا۔ اس زمانے میں انگریزوں کی ترقی کا ایک سبب جمہوریت میں نظر آیا اور کچھ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جمہوریت اگر اچھی چیز ہے تو بادشاہت یقیناً بری ہوگی۔ چنانچہ زوال اُمت کا ایک سبب ملوکیت بھی سمجھا جانے لگا اور ایک ہی جست میں اسباب زوال اُمت کی تحقیق عہد عباسیہ سے عہد بنی اُمیہ تک جا پہنچی۔ اب اس پوری تحقیق کا خلاصہ یہ تھا کہ زوال کے اسباب ہیں غیر اسلامی اثرات۔ ان غیر اسلامی اثرات میں تصوف، کلام، فقہ اور ملوکیت سب شامل ہیں اور ان سب کا آغاز ہوا ہے۔ خلافت راشدہ کے خاتمے سے، لیکن یہ تحقیق یہاں پہنچ کر بھی نہیں رُکی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خلافت راشدہ کیوں ختم ہوئی۔ آخر اس کا بھی تو کوئی سبب ہوگا۔ یہ سبب تلاش کیا جانے لگا تو خود خلافت راشدہ کے دور میں اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا سبب قرار دیا گیا۔"(۱)

اس تفصیل میں ایک اور بات کا اضافہ بھی کر دیا جائے کہ منکرین حدیث نے حدیث کی جمع و تدوین کو اُمت کے زوال کے اسباب میں ایک بڑا سبب قرار دیا۔ گویا مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں جو کچھ جمع کیا تھا، جو کارنامے کیے تھے، وہ بیک جنبش قلم زوال کا سبب ٹھہرے اور ان نیم خواندہ

۱۔ سلیم احمد، اسلامی نظام، ص ۱۵۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کی نظر میں گمراہی قرار پائے۔ ان تمام بحثوں میں ایک بات بہت اہم رہی اور وہ ہے اسلامی ریاست کا قیام۔ برصغیر میں یہ بحث دوسرے مسلمان ممالک سے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے جغرافیے میں مسلمان عددی اعتبار سے ۵۰ فیصد سے بھی نصف تھے۔ اس لیے بعض مسلمان راہنماؤں نے انہیں باور کرایا کہ وہ اقلیت ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ مطالبہ سامنے آیا کہ مسلمانوں کو ایک ایسی ریاست کی ضرورت ہے جہاں وہ اکثریت میں ہوں۔ وقتی طور پر یہ سوال نظر انداز کر دیا گیا کہ غیر مسلم اکثریتی علاقے میں جو مسلمان بچ رہیں گے ان کا کیا بنے گا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انھیں یہ فیصلہ سنایا گیا کہ وہ اپنے ملک سے وفادار رہیں گے۔ اس دوران میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ مسلمان صرف دینی وحدت ہی نہیں، ایک سیاسی وحدت بھی ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے ایک رقبہ کے ساتھ ساتھ ایک زبان بھی لازمی ٹھہرائی گئی اور وہ اُردو تھی۔ ان ساری باتوں پر خاصی ہنگامہ خیز بحثیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے زبان کے مسئلے پر بحث اب تک جاری ہے۔ مسلمانوں کے ایک سیاسی وحدت ہونے کے مسئلے پر بحث محدود دائرے میں ہو رہی ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ تو اب بھی پیش کیا جاتا ہے، مگر اس حوالے سے مکمل خاموشی برتی جا رہی ہے کہ ہندوستانی مسلمان بھی مسلمان قومیت کا حصہ ہیں یا ہندوستانی قومیت کا اور مسلمان قومیت عالمگیر ہے یا پاکستان کے جغرافیے میں محدود؟ بہر حال ہمارا مقصد اُس عہد اور اپنے عہد کے مباحثوں کے متعلق اشارہ کرنا تھا، بحث کرنا نہیں تھا۔

اب ایک بہت اہم موضوع سامنے آتا ہے کہ اسلامی ریاست کیا ہے؟ پاکستان چونکہ اسلامی ریاست ہے، اس لیے اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اس کا نظام کیا ہوگا؟ اسلام ہم سے کس قسم کی ریاست کا مطالبہ کرتا ہے؟ قرآنِ مجید اور سنت رسول میں اس ریاست کی کیا تصویر سامنے آتی ہے؟ تاریخ اسلام میں دکھائی دینے والی مسلمانوں کی ریاستوں کو کس حد تک اسلامی یا غیر اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ ہم ان ریاستوں کو مسترد کرنے کے کہاں تک پابند ہیں؟ یہ وہ سوالے ہیں جن پر قیام پاکستان سے پہلے بحث و تمحیص کا آغاز ہوا اور یہ بحث و مباحثہ اب تک جاری ہے۔ اس پر بحث کرنے سے پہلے ہم ایک اور سوال کو زیر غور لاتے ہیں کہ اسلام سے پہلے دین کی تعبیر کیا تھی؟ اسلام نے دین کو کس انداز میں پیش کیا؟ اب اسے کس انداز میں سمجھنے اور کس تعبیر کو اس کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسلام سے قبل حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے پیغمبروں کے ماننے والوں کے دو بڑے گروہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھے۔ یہودی اور عیسائی۔

دونوں گروہوں نے دین کے ساتھ یہ تعبیرات منتفی کر رکھی تھیں:

(۱) دین ایک ریاست کا نام ہے۔ یہ یہودی تعبیر تھی۔

(۲) دین چرچ ہے۔ یہ مسیحی تعبیر تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مبعوث ہوئے تو یہودی چنے گئے لوگ ٹھہرے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فراعنۂ مصر کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس کی طرف لے گئے۔ یہود کا دین اس وقت مکمل ہوا جب وہ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کی عظیم الشان حکومتیں قائم ہوئیں۔ جب سے اب تک یہود بیت المقدس پر عظیم الشان حکومت اور سیاسی غلبے کو دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ اسی غلبے کے لیے دیوارِ گریہ کے پاس کھڑے ہو کر روتے تھے اور اسی کے قیام کے لیے دعائیں کرتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے بائبل کے مطابق واضح کر دیا کہ قیصر اور خدا کے حقوق ادا کرتے رہو۔ عیسائیوں نے دین کو چرچ تک محدود کر دیا۔ اب عیسائی مذہب چند دعاؤں کا نام ہے یا چند رسوم کا۔ چند عقائد اس پر مستزاد ہیں اور بس۔ ایک زمانے تک چرچ نے بادشاہ پر غلبہ حاصل کیے رکھا، مگر اب چرچ اور کراؤن الگ الگ ہو چکے ہیں اور تقسیم کار کا اصول واضح ہو چکا ہے۔

ان دونوں ادیان کے مقابلے میں اسلام کے مدنظر جو مقاصد تھے وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعبیر کے مطابق یہ تھے:

(۱) جزیرہ نمائے عرب کو شرک سے پاک کرنا

(۲) قیصر و کسریٰ کے ظالمانہ نظاموں کا خاتمہ

گویا اسلام کی روحانی بنیاد توحید ہے اور اس کا سیاسی نظام عدل کا قیام ہے۔ یہ شرک اور ظلم دونوں کو ختم کرتا ہے۔ یہ کسی نسل کے غلبے کی بجائے عدل کے قیام کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

قرآن مجید نے مسلمان فرد کی تربیت اور مسلمان معاشرے کے قیام کو موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں عبادات اور اخلاقیات کے متعلق تفصیلی احکام ملتے ہیں تاکہ مسلمان فرد بھی پیدا ہو سکے اور مسلمان معاشرہ بھی۔ مسلمان معاشرے کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی تفصیلی احکام ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کے گھر میں جانے کے اوقات تک بیان کر دیے گئے ہیں۔ دعوت میں کھانے کے بعد جلد اُٹھ جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح کی بے شمار جزئیات ملتی

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، مگر ریاستی امور پر صرف اصولی احکام ملتے ہیں۔ ظالمانہ نظاموں کے خاتمے کے بارے میں بہت سی تفصیل فرعون کی حکومت کے ضمن میں بیان کر دی گئی ہے۔ مسلمان ریاست کا مرکزی اصول عدل ٹھہرایا گیا ہے اور اسے دعوت دین کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا اسلام کا مقصد فرد اور معاشرہ ہے اور ریاست اس معاشرے کا جزو۔ برصغیر میں اسلامی ریاست کی تشریح وتعبیر کے حوالے سے بھی تین قسم کے نقطہ ہائے نظر سامنے آئے:

(۱) اسلامی ریاست بطور نظریے اور مقصد دین کے۔

(۲) مسلمانوں کی سیکولر ریاست۔

(۳) مسلمان معاشرے کی قرآن وسنت کے مطابق تعبیر، حدود اللہ کے نفاذ اور عدل پر مبنی سیاسی نظام کے قیام کی جدوجہد۔

پہلے نقطۂ نظر کے حامل دو مختلف گروہ ہیں۔ ایک گروہ کے قائد مسٹر پرویز تھے اور دوسرے گروہ کی نمائندگی جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کرتے ہیں۔ دوسرے نقطہ نظر کی نمائندگی مسلم لیگ کرتی نظر آ رہی ہے اور تیسرے نقطہ نظر کی نمائندگی علمائے دیوبند کے ہاں ملتی ہے۔ اب ہم ان تینوں نقطہ ہائے نظر پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

مولانا مودودی نے تواتر سے اسلامی نظام کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ دین کو ایک سیاسی نظام کے طور پر دیکھتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دعوت دین کے عمل کو تحریک اسلامی کی اصطلاح کے ذریعے سمجھتے ہیں۔ گویا دین ایک سیاسی تحریک کے طور پر پیدا ہوا، ابھرا اور پھلا پھولا۔

مولانا مودودیؒ نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کی تین جلدوں میں حکومت الٰہیہ کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں لکھ کر دین کی سیاسی تعبیر پیش کی۔ اس کتاب کے خلاف مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا وحید الدین خان نے جامع کتب تصنیف کیں۔ ان بزرگوں نے مولانا مودودی کے نقطۂ نظر کو سلف کے نقطۂ نظر سے مختلف اور بعض مقامات پر متضاد ٹھہرایا۔ مولانا مودودی نے اپنے پیش کردہ نظریہ سیاسی کا تاریخ اسلام پر اطلاق کیا تو خلافت وملوکیت وجود میں آئی جس پر مسلم دنیا میں وہ ردعمل سامنے آیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کتاب کی تردید میں درجن بھر علمی اور سنجیدہ کتب لکھی گئیں۔

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں دین کی بجائے نظام کی اصطلاح بہت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کثرت سے استعمال کی گئی۔ حالانکہ یہ دونوں مختلف اصطلاحیں تھیں۔ دین قرآن مجید میں ایک سے زائد، بلکہ بہت سے مفاہیم میں استعمال ہوا ہے، مگر دین کا عمومی مفہوم مدنظر رکھا جائے تو کسی طرح بھی نظام کے لفظ کو دین کا قائم مقام نہیں کہا جا سکتا۔ سلیم احمد نے وضاحت کے ساتھ ان دونوں لفظوں کے فرق پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''دین اور نظام کا پہلا بنیادی فرق ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہے اور نظام انسانوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ دونوں انسانی مسائل کا ایک دوسرے سے بالکل جدا تصور رکھتے ہیں۔
> دین میں انسان کا سب سے پہلا، سب سے بنیادی، سب سے اہم مسئلہ نجات اخروی ہوتا ہے۔ جبکہ نظاموں میں انسانوں کا واحد مسئلہ نجات دنیوی ہوتا ہے۔ دین آخرت کے لیے ہوتا ہے اور نظام دنیا کے لیے۔
> دین اور نظام کا تیسرا بڑا فرق یہ ہے کہ دین کا مرکز خدا اور نظاموں کا مرکز انسان ہوتا ہے۔''(۱)

محولہ بالا اقتباس میں صرف اتنی بات سے جزوی اختلاف ہو سکتا ہے کہ دین آخرت کے لیے تو ہوتا ہے دنیا کے لیے بھی ہوتا ہے۔ بقیہ باتیں ایسی بدیہی حقیقتیں ہیں جن سے اختلاف کرنا ممکن نہیں۔

علماء کے ہاں دین کے مفہوم سے متعلق جو باتیں ملتی ہیں اُن کا خلاصہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے یوں پیش کیا:

> ''مراد اس دین سے اصول دین ہیں جو مشترک ہیں تمام شرائع میں مثل توحید و رسالت و بعثت ونحوہ''۔(۲)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے دین کا جو مفہوم پیش کیا ہے وہ بھی ذرا دیکھ لیا جائے۔ مولانا دین کی تشریح میں ارشاد فرماتے ہیں:

> دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں اسٹیٹ کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ اسٹیٹ ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے اور دین حق یہ ہے

۱۔ سلیم احمد، اسلامی نظام، ص ۱۴ ۔ ۲۔ اشرف علی تھانوی مولانا، بیان القرآن، سورۃ شوریٰ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ انسان دوسرے انسانوں کی خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اس کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے، صرف اللہ کے لیے ہے"(۱)۔

اس تمام پیراگراف میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں قابل اعتراض باتیں یہ ہیں:

(۱) یہ تمام اقتباس حقیقت سے زیادہ شاعری ہے۔

(۲) اس میں دین کی ایک سیکولر تعبیر ملتی ہے۔ دین کا روحانی اور عباداتی حوالہ غائب ہے۔ عبدیت / عبودیت کو دین میں جو مقام حاصل ہے، وہ محولہ بالا پیراگراف میں غائب ہے۔

(۳) دین کو اسٹیٹ کا ہم معنی قرار دینا دین کی ایسی منفرد تعبیر ہے جس کی سلف میں مثال نہیں ملتی۔

(۴) محولہ بالا اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ دین مان لیا جائے تو اُن ممالک کے مسلمانوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے جو غیر مسلم اکثریت کے ماتحت آباد ہیں۔

(۵) اس طرح کے افکار جو ذہن پیدا کرتے ہیں، اُن کا ہلکا سا کرشمہ ڈاکٹر اسرار کا انڈیا میں یہ بیان ہے کہ سیکولرازم کفر ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس کے خاتمے اور اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اب اقامت دین کی اصطلاح شرعیہ کا ان کے ہاں ایک خود تراشیدہ مفہوم ہے اور وہ یہ کہ ان کے مزعومہ اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد، حالانکہ تمام مسلمان علماء وفقہاء، دانشور اور مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے احوال میں مسلمانوں کے لیے سیکولرازم ہی مفید اور قابل عمل ہے۔

۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تعبیر دین کے روحانی پہلو کی مکمل نفی پر استوار ہے۔ اس تعبیر کے پیش کرنے والے دراصل دین کے بارے میں اپنی منفرد رائے پیش کر رہے تھے، مگر اس انداز میں پیش کر رہے تھے گویا دین کا صرف اور صرف یہی مفہوم ہے اور ہمیشہ یہی مفہوم مروج و مسلم رہا ہے۔ اس تعبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کی اکملیت کو یوں پیش کیا گیا کہ دین اجتماعی ہے اور مذہب انفرادی۔ یہ بھی ایک نیا انداز فکر تھا۔ اس تعبیر میں دیگر ادیان کو مذہب کہا گیا اور اسلام کو دین۔ یہی نہیں روایتی انداز فکر کو مذہب کہا گیا اور ان کے پیش کردہ ضابطہ حیات کا نام دین ٹھہرا۔ یہ بات شدومد سے کہی گئی کہ دین مکمل ضابطہ حیات ہے اور مذہب صرف عقائد و رسوم کا نام ہے۔ یہ باتیں بھی بغیر سند اور دلیل کے تھیں۔ قرآن مجید نے اسلام اور دیگر ادیان میں اس طرح کی کوئی تفریق نہیں کی۔

اس نقطۂ نظر کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ اسلام کا تقابل دیگر ادیان کی بجائے نظاموں سے ہونے لگا اور یوں اک ایسا علم کلام تیار ہوا جس میں اسلام کا صرف قانونی پہلو پیش کیا گیا اور اسلام کے قانونی پہلو کی وہ تشریح پیش کی گئی جو سرمایہ داری سے زیادہ سوشلزم کی مخالف بن کر سامنے آئی۔ اس علم کلام کی سرد جنگ کے زمانے میں جو ضرورت تھی اور جو فوائد تھے، وہ آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے میں اسلام کے حوالے سے تیار ہونے والا یہ علم کلام امپیریلزم کے لیے بہت مفید بھی تھا اور پسندیدہ بھی۔ اسی لیے اس طرح کا بہت سا لٹریچر امپیریلسٹ ممالک میں سرکاری طور پر شائع بھی ہوا اور تقسیم بھی ہوا۔

دوسرا نقطۂ نظر سیکولر ریاستوں کا نقطۂ نظر ہے۔ پاکستان میں یہ لوگ قرآن وحدیث سے استدلال کرنے کی بجائے علامہ اقبال کی کتاب Reconstruction of Religious thought in Islam سے استدلال کرتے ہیں یا مسلم لیگ کے راہنما قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے خطاب سے۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا اُس کی تعبیر کرتے ہوئے جسٹس منیر نے Jinnah to Zia میں سیکولر پاکستان کی تعبیر پیش کی۔ یہی تعبیر آج کل Enlightened Moderation کے نام سے متعارف ہو رہی ہے۔ یہی وہ تعبیر ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمن نے ''اسلام'' میں پیش کی تھی۔ بعض ماہرین اقبالیات اقبال کے اس نظریے کی بنیاد پر کہ ترکیہ میں ہونے والی نئی قانون سازی ایک نیا اجتہاد ہے، یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال بھی سیکولرازم کے قائل تھے۔ جسٹس منیر نے اپنی مذکورہ کتاب میں جناح اور اقبال کے حوالے سے سیکولرازم کی بھرپور وکالت کی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا خلاصہ یہ ہوا کہ گروہِ اوّل کے نزدیک اسلامی ریاست ہی اسلام کا مقصودِ اصلی ہے۔ اس نقطۂ نظر نے ایک خاص ذہن پیدا کیا اور اس ذہن نے اس قسم کی تحریریں رقم کیں۔ اسلام اور جمہوریت، اسلام اور سوشلزم، اسلام اور کمیونزم، اسلام اور جدید معاشی نظریات وغیرہ۔ گویا اسلام بھی ایک قسم کا سیاسی نظام ہوا۔ اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر جون ایلیا نے ایک بار راقم سے کہا:

''اسلام کوئی دین تو ہے نہیں، یہ تو ایک سیاسی نظریہ ہے''۔

خاکسار نے عرض کیا ''اور ہم جو شریعت وطریقت دونوں کو مانتے ہیں ہم کیا ہوئے؟''

جون ایلیا نے فوراً کہا: ''ہاں آپ کے ہاں تو دین ہے''۔

اسی نقطہ نظر پر ردِعمل کی صورت یہ پیدا ہوئی کہ انور شیخ نے Islam an Arab National Movement لکھ کر ثابت کیا کہ اسلام تو عربوں کی ایک قومی سیاسی تحریک تھی۔ انور شیخ کی گمراہی بجا، مگر اُس نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی ہے، اُس کا نصف اوّل تو اسلام کے خیر خواہوں نے اسلام کو ایک سیاسی تحریک کہہ کر پیش کیا تھا۔

گروہ ثانی عیسائیت کی طرح اسلام کو مسجد تک محدود کرنے کا خواہاں ہے۔ مسلم لیگ جب اقتدار میں ہوتی ہے تو عموماً یہی نظریہ شدومد سے پیش کرتی ہے۔

اب گروہِ ثالث روایتی علماء کا ہوا۔ ان لوگوں نے اسلام کو بطور دین تسلیم بھی کیا اور پیش بھی کیا۔ اِسے پورے معاشرے پر حاوی کرنے اور اسے فرد کی تربیت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ان علماء کے ہاں تبلیغ، تعلیم اور سیاست کے تینوں شعبوں میں کام ہوا۔

علمائے حق نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ریاست کے امیر کے عزل ونصب کا کوئی اصول منصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے امیر المومنین کے عزل ونصب کے بہت سے طریقوں کو جائز قرار دیا۔ علمائے حق نے کبھی ایک خاص نظام کو نافذ کرنے کو مقصود قرار نہیں دیا، بلکہ ریاست کو شریعت کے احکام وقوانین کے نفاذ کا ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل نہ تو مسلمانوں کو سیاسی مفہوم میں ایک الگ قوم تسلیم کیا اور نہ ایک خاص نظام کے قیام کے لیے تحریک چلائی۔ اس کے برعکس انہوں نے ہر حال میں شریعت کی بالادستی اور اس پر عمل کے لیے مختلف ذرائع، جن میں سیاسی ذرائع بھی شامل تھے، اختیار کیے۔ اس کی مختصر تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) برصغیر کے بعض مسلمانوں نے ایمان کی کمزوری دکھاتے ہوئے وراثت کے شرعی قوانین کی بجائے رواج کو اپنایا۔ جمعیۃ علمائے ہند نے اس کے خلاف جدوجہد کی۔ عوام میں تبلیغ کے ذریعے شعور بیدار کیا اور انھیں شرعی قوانین وراثت پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ جمعیۃ نے مزید آگے بڑھ کر صوبہ سرحد میں دوسری جماعتوں کے تعاون سے شریعت کے قانون وراثت کو شریعت بل کے ذریعے نافذ کرایا۔ اس بل میں مسلمانوں کے لیے نکاح، طلاق، وراثت اور ترکہ کے تمام امور میں شرعی قوانین کی پابندی ضروری قرار دی گئی۔

(۲) برطانوی سامراج نے سول میرج ایکٹ کے ذریعے بین المذاہب شادیوں کو قانونی جواز مہیا کیا۔ یہ ایک خطرناک قانون تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند نے اس کے خلاف آواز بلند کی، مگر مسلم لیگی قائدین نے اس قانون کو مسلمانوں تک وسیع کرنے کی ترمیم پیش کر کے منظور بھی کروالی۔ جمعیۃ علمائے ہند اس قانون کے خلاف مسلسل آواز بلند کرتی رہی۔

(۳) مسلمانوں میں نظم جماعت کے قیام کی کوشش کی گئی، تاکہ ان کے مابین اخوت اسلامی کی بنا قائم کی جا سکے اور ان کے مسائل شرعی بنیادوں پر حل کیے جا سکیں۔ یہ کوشش ۱۹۱۳ء میں شروع ہوئی، مگر حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے باعث آگے نہ بڑھ سکی۔ جمعیۃ علمائے ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی تو اس کے دوسرے اجلاس میں یہ تحریک پیش ہوئی۔ چنانچہ بہار، پنجاب اور دوسرے صوبوں میں امارت شرعیہ کے قیام کی کوشش ہوئی۔ یہ امارت بہار میں صحیح معنوں میں قائم ہو گئی۔ یہ اب تک قائم ہے اور مسلمانوں کے مسائل شرعی بنیادوں پر حل کرنے میں کوشاں ہے۔

(۴) علمائے حق نے سیاسی امور میں شرعی اصول وضوابط کی روشنی میں اُمت کو راہنمائی مہیا کی۔ ۱۹۳۱ء میں علماء نے سیاسی مسائل کے حل کے لیے ایک فارمولا منظور کیا، یہ بعض اضافوں کے ساتھ فروری ۱۹۴۵ء کے جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس میں منظور ہوا۔ اسے تاریخ میں مدنی فارمولا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فارمولا کابینہ مشن کو پیش کیا گیا۔ جب کابینہ مشن کا پلان شائع ہوا تو اس کے بہت سے نکات مشن کے پلان میں شامل تھے۔

(۵) قیام پاکستان کے بعد علماء نے شرعی قوانین کے نفاذ اور آئین کی اسلامی اصولوں کے مطابق تدوین پر زور دیا۔ اس سلسلے میں علماء نے بائیس نکات تیار کیے۔ یہ نکات پاکستان بھر کے علماء کی متفقہ رائے سے تیار ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ علماء اسلام نے ان نکات کو اپنے منشور کا حصہ بنایا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بہت سے شرعی نکات آئین کا حصہ بنے۔ اس سلسلے میں جمعیۃ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اکابر کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

(٦) علمائے حق نے بعض حلقوں کی طرف سے پیش کی گئی اسلامی ریاست کی آئیڈیالوجی کی نفی بھی کی۔ اس سلسلے میں علماء نے خلافت وملوکیت کو علمی اور فکری سطح پر مسترد کر دیا کیونکہ اس کتاب میں خلافت کے نظام کے حوالے سے بہت سی ذاتی تعبیرات کو منصوص قرار دیا گیا تھا۔ نیز تاریخی مغالطوں، مفروضوں اور غلط روایات کو تاریخ کا درجہ دیا گیا تھا۔

(۷) علمائے حق نے سیاسی امور پر بہت سی آراء پیش کیں، مگر انھوں نے نص اور اپنی رائے میں ہمیشہ فرق کیا۔ نص میں کسی ترمیم کو برداشت نہ کیا اور ذاتی رائے کو نص کا درجہ نہ دیا۔

(۸) نیم خواندہ مفکر غلام احمد پرویز نے اسلامی آئیڈیالوجی کے نام پر ایک سیاسی نظام پیش کیا، مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ سب اُن کی اپنی آراء تھیں جنھیں وہ نص کا درجہ دے رہے تھے۔ علماء نے اس فتنے کی سرکوبی کی اور مسٹر پرویز کی آراء کی حقیقت واضح کی۔ درحقیقت پرویز کا فکر قرآن فہمی پر مبنی ہونے کی بجائے قرآن کی نفی پر استوار تھا۔

(۹) علمائے نے سیاست کو دین کے فروغ کا ذریعہ بنایا۔ اسے کبھی مقصود نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز مسجد، مدرسہ اور خانقاہ ہی رہے۔ اُن کی سیاست ان مراکز کو مضبوط بنانے کا ذریعہ رہی۔ ان دنوں مدارس کے تحفظ کی تحریک میں جمعیۃ علماء اسلام قیادت کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔

(۱۰) لادینی نظریات اور باطل گروہوں کے خلاف جمعیۃ علماء اسلام نے ہمیشہ بھرپور جدوجہد کی۔ مرزائی گروہ کو مولانا مفتی محمود کی تحریک پر قومی اسمبلی میں کافر قرار دیا گیا۔ ایوبی دور میں سود کے جواز کے لیے ہونے والی کوششیں مولانا مفتی محمود کی کاوشوں سے ناکام ہوئیں۔

(۱۱) علماء نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سیاست میں عدم تشدد کے اصول کو اپنایا اور جمہوری اداروں کو تسلیم کیا۔ علماء نے نہ تو ان اداروں کو کبھی حرام قرار دیا اور نہ انھیں منصوص ٹھہرایا۔ اسے عہد حاضر کا عرف مان کر تسلیم کیا اور ان میں شرکت کی۔ ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں جمعیۃ علماء ہند نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ذریعہ الیکشن میں حصہ لیا اور بھرپور کامیابی حاصل کی۔ علماء نے جمہوری اداروں کو تسلیم کیا اور جمہوری کلچر کے فروغ میں حصہ لیا۔

۱۹۴۶ء کے الیکشن میں جس قسم کی بدزبانی اور بدکلامی روا رکھی گئی اور جس قسم کے غیر جمہوری رویے اپنائے گئے، علماء نے اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچائے رکھا۔ ۱۹۴۶ء کے دور میں شیخ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الاسلام مولانا مدنی[1] سے ہونے والی بدتمیزی اور بدتہذیبی کے ذکر سے تاریخ کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور کے ایک مسلم لیگی کارکن غلام کبریا لکھتے ہیں:

> ''پبلک جلسہ اسی وقت ہوتا جب کوئی مسلم لیگی لیڈر علاقے میں آتا تھا۔ یہ کہنا کہ ان جلسوں میں اچھی خاصی حاضری ہوتی تھی حقیقت کو کم کرنا ہوگا۔ زبردست اور پرہجوم جلسے ہوتے تھے، لیکن مقرر جو ایک کے بعد دوسرے آتے محض کانگریس اور ہندوؤں کو برا بھلا کہتے اور اس سے بھی کہیں شدت سے اور بھونڈے انداز میں ان مسلمان گروہوں اور پارٹیوں کی مذمت کرتے جو مسلم لیگ سے متفق نہ تھے۔ کبھی ان کا مذمتی بیان بڑا فحش ہوتا۔ ان میں جو گروہ اور پارٹیاں نشانہ بنتیں وہ تھیں جمعیۃ علماء ہند، کانگریسی مسلمان، خاکسار، احرار اور وہ لوگ جو قوم پرست مسلمان کہلاتے تھے۔ کبھی کبھی تو جناح بھی بہک جاتے۔ مثلاً انہوں نے آزاد (مولانا ابوالکلام) کو کانگریس کا صدر اور مسلم شو بوائے کہہ دیا۔ ان کی پارٹی کے نچلے لوگوں نے اس عدم رواداری کی مثال کو اپنا لیا اور بڑی وفاداری سے اس پر عمل کیا''۔

(۱۲) یہ بات بھی تاریخ سیاست کا لطیفہ ہے کہ علمائے حق نے اپنے سیاسی مخالفوں کو کبھی کافر نہیں کہا۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے رائے کو نص کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ اس کے برعکس مسلم لیگیوں نے ۱۹۴۷ء میں اور دائیں بازو کی مذہبی اور غیر مذہبی جماعتوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اپنے سیاسی مخالفوں کو کافر کہنے سے گریز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ علمائے حق ان سیاسی فتووں کا نشانہ بنتے رہے۔ وجہ یہی کہ یہ لوگ اپنی رائے اور نص میں تفریق نہیں کرتے تھے۔ علماء سمجھتے تھے کہ نص کا انکار کفر ہے جبکہ یہ لوگ اپنی رائے کو نص قطعیہ کا درجہ دیتے اور سیاسی مخالفین کی تکفیر کرتے تھے۔

اب اس پس منظر میں ہم علامہ اسد کی کتاب The Principle of state & Govt in Islam کا جائزہ لیتے ہیں جس کا اُردو ترجمہ اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول ہمارے پیشِ نظر ہے۔

علامہ اسد ایک نومسلم ہیں۔ آپ کا تعلق آسٹریا کے ایک یہودی خاندان سے تھا۔ آپ نے

۱ـ غلام کبریا، آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ، ترجمہ: حسن عابدی، ص ۷۰،۷۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۲۶ء میں اسلام قبول کیا اور بقیہ زندگی دعوت و تبلیغ اور تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ آپ کی دینی تربیت زیادہ تر Academic ہے۔ آپ نے یقیناً عربی زبان پر عبور حاصل کیا اور فہم دین کے حصول کے لیے مقدور بھر سعی کی۔ کسی صوفی بزرگ یا شیخ سے اُن کی وابستگی کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے دین کے وہ علوم جنہیں تصوف کہا جاتا ہے، کا تذکرہ ان کے ہاں بالعموم نہیں ملتا۔ اس کے باوجود وہ قرآن وسنت کے بارے میں وسیع علم کے حامل تھے۔

زیر نظر تصنیف کو دیکھیں تو بعض جزئی اختلافات کے باوجود اس تصنیف کے مصنف کو علمائے حق کے دائرے میں شامل کرنا پڑے گا۔ بہت سے امور میں اُن کے خیالات واضح ہیں اور افکار پر بینات کا عکس ملتا ہے۔ انہوں نے اس تصنیف میں بہت سی ایسی باتیں کہہ دی ہیں جنھیں بہت سے اہل علم بیان کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ کیونکہ اسلامی ریاست کی فلاسفی کو پروپیگنڈے کے آسرے پر اتنا پھیلا دیا گیا ہے کہ انہیں بعض لوگوں کے نظریات کی بجائے نصوص کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

علامہ اسد نے نصوص کے متعلق جو نقطۂ نظر اپنایا ہے وہ قطعی، دوٹوک اور ہر قسم کی مداہنت سے پاک ہے۔ وہ نصوص کے بارے میں کسی مفاہمت یا معذرت خواہی کا شکار نہیں ہوتے۔

> ''شریعت الٰہی قانون کا مجموعہ ہے۔ اسے کلاً قرآن وسنت کے قطعی احکام کی شکل میں دیکھنا چاہیے یعنی وہ احکام جن کے متعلق مثبت قانونی وضع میں بتا دیا گیا ''یہ کرو اور یہ نہ کرو'' ''یہ چیزیں خیر ہیں، اس لیے مطلوب ہیں'' ''یہ چیزیں شر ہیں، اس لیے ان سے بچنا چاہیے'' ان احکام کو نصوص کہتے ہیں۔ ان کی مختلف تعبیرات کی ہی نہیں جا سکتیں، بلکہ ان میں تعبیر کی ضرورت ہی نہیں''۔

علامہ اسد نے اس کتاب میں نہ اپنے خیالات واستنباطات کو نص کا درجہ دیا ہے، نہ کسی دوسرے مصنف کی کسی تعبیر یا استنباط کو۔ انھوں نے ابتدائی مرحلے پر یہ واضح کر دیا ہے کہ شریعت میں امور سیاسیہ کے بارے میں تفصیلی احکام موجود نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن وسنت کے واضح احکام کا دائرہ اتفاقی اغماض کی بنا پر محدود نہیں رہا، بلکہ عمداً اس اہم مصلحت کی بنا پر محدود رکھا گیا کہ قانونی و عمرانی لوچ اور لچک پر کوئی اثر نہ پڑے۔ غرض یہ سمجھ لینا معقول ہے کہ شریعت میں تمام

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروریاتِ زندگی کی تفصیلات دانستہ بیان نہیں کی گئیں"۔

آپ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اس میں (اسلامی شریعت میں) زندگی کی ہر ضرورت کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کیا جا سکتا تھا"۔

مصنف کسی خاص قسم کے نظام کو اسلامی ماننے کو تیار نہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ریاست کے کسی مخصوص ڈھانچے کو اپنانے کی بجائے اسلام کے غیر مشتبہ قوانین کو ریاست میں نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"اسلامی مملکت کے ظاہری اشکال و وظائف کے لیے ضروری نہیں کہ وہ لازماً کسی تاریخی نمونے کے مطابق ہوں۔ کسی مملکت کے لیے اسلامی کہلانے کا استحقاق حاصل کرنے کی غرض سے صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے دستور اور کاروبار میں اسلام کے وہ غیر مشتبہ قوانین واضح طور پر شامل ہو جائیں جنھیں اُمت کی عمرانی، سیاسی اور اقتصادی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے"۔

اس پیراگراف کو غور سے پڑھیں تو خلافت وملوکیت کی وہ ساری بحثیں بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہیں جن میں سیاسی ڈھانچے میں کسی تبدیلی کی بنا پر خیر وشر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ علامہ اسد کے ہاں سیاسی ڈھانچے کی کوئی خاص شکل مقصود ومطلوب نہیں ہے۔ یہ بات وہ پوری صراحت سے یوں بیان کرتے ہیں:

"میں خصوصیت سے اس فکر ونظر کا ذکر کر رہا ہوں جو مسلمانوں میں پہلے بھی رائج رہا اور اب بھی رائج ہے۔ یعنی مملکت کی صرف ایک وضع اسلامی ہے جو چاروں خلفائے راشدین کے ماتحت رونما ہوئی اور اس نمونے سے ذرا بھی انحراف مملکت کی اسلامی حیثیت میں لازماً کمی کر دے گا۔ اس سے زیادہ غلط خیال کوئی نہیں ہو سکتا"۔

مصنف کے نزدیک خلفائے راشدین کے عہد کا سیاسی ڈھانچا اور مملکت کی مخصوص وضع مقصود نہیں۔ تقویٰ کا انحصار اس ظاہر پر نہیں، بلکہ اُس مقصود پر ہے جو ہمیشہ خلفائے راشدین کے مدنظر رہا۔ اسلام کسی خاص سیاسی ڈھانچے کو مقصود نہیں ٹھہراتا، بلکہ شریعت کے احکام کو مقصود ٹھہراتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ یہ مقصد خلفائے بنی اُمیہ کے دور میں بعض مستثنیات کے ساتھ اُمت کے مدنظر رہا اور مابعد کے ادوار میں بھی مدنظر رہا۔

علامہ اسد کے نزدیک ریاست اور مملکت مقصود نہیں ذریعہ ہیں۔ مقصد دین حق کا تغلب اور کلمۂ حق کا اعلاء ہے۔ ملت کی ترقی اور نشو وارتقاء ہے۔ علامہ اسد واضح لفظوں میں لکھتے ہیں:

"اسلامی مملکت بجائے خود مقصد و نصب العین نہیں ہے بلکہ محض ایک ذریعہ ہے۔ مقصد و نصب العین یہ ہے کہ وہ ملت نشو وارتقاء پائے جس کے افراد مساوات و انصاف کے داعی ہوں۔ حق کے لیے باطل کے خلاف جدوجہد کریں یا زیادہ واضح الفاظ میں ایک ملت کا نشو وارتقا ہو جس کے افراد ایسے معاشرتی حالات پیدا کریں اور انہیں قائم رکھیں، جن کے تحت افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے خدا کے فطری قانون یعنی اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اس نصب العین کے حصول کی ایک ناگزیر شرط یہ ہے کہ افراد ملت کے درمیان اخوت کا زبردست احساس پیدا ہو جائے اور ترقی پائے"۔

یہ ہے اسلام کے سیاسی نصب العین کی وہ تعبیر جو علامہ اسد نے پیش کی ہے۔ اب اس تعبیر کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ کی وہ تعبیر دیکھیں جو الدین کے مفہوم میں انہوں نے پیش کی ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ان دونوں تعبیرات میں صبح و شام اور قطبین کے فاصلے ہیں۔ وہاں ریاست مقصود و مطلوب ہے، یہاں ذریعہ ہے۔ وہاں دین کا مفہوم ہی ریاست ہے، یہاں دین نام ہے اقدار کا اور شریعت اسلامیہ کا۔ وہاں دین کا اول و آخر سیاست ہے اور یہاں دین کا اوّل و آخر اقدار و حکام ہیں جو دین حق میں مختصر یا مفصل بیان کیے گئے۔

علامہ اسد شریعت اور ریاست کے دوائر میں بھی تفریق کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں شریعت حقہ کا دائرہ وسیع ہے اور ریاست و مملکت کا دائرہ محدود ہے۔ علامہ اسد لکھتے ہیں:

"یہ نکتہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ مملکت کے دائرۂ اختیار کو عوامی اختیارات تک محدود کر دینے کا مطلب یہ نہیں، شریعت حقہ کا دائرہ بھی اسی طریق پر محدود کیا جا سکتا ہے۔ شریعت بے شک و شبہ انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے، خواہ وہ عوامی ہو یا نجی، لیکن ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت ایک عمرانی نظام ہے اور اسے صرف انسانی زندگی کے عمرانی پہلو سے تعلق ہے''۔

محمد اسد کے ہاں اس قدر وسیع خیر کے ساتھ بعض کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں قرآن وسنت کے نصوص پر جس قدر غیر متزلزل تیقن اور ایمان ملتا ہے، اجماع صحابہ کے بارے میں وہ یقین نہیں ملتا، بلکہ اجماع صحابہ کے بارے میں اُن کا ذہن بہت حد تک غیر واضح ہے۔ ایک جگہ انھوں نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے شخص کے لیے دین کو سمجھنے کے لیے صحابہ سے بھی زیادہ بہتر مواقع موجود ہیں۔ وہ اس مقام پر یہ بات نظر انداز کر گئے کہ دین حق کو سمجھنے کے لیے تاریخی شعور ہی کافی نہیں، دل کے نور کی بھی ضرورت ہے اور یہ نور نبوت کے سراج وہاج سے روشنی حاصل کرنے والوں کو جس قدر آسانی اور وسعت سے میسر آ سکتا تھا، آج اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کی تصریح متعلقہ مقام پر حاشیے میں کر دی گئی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ایک بحث یہ اُٹھائی ہے کہ مغربی اصطلاحات کے غلط استعمال کے کس قدر غلط نتائج سامنے آئے ہیں۔ ہمارے عہد میں مغرب کے سیاسی غلبے نے ان کے افکار و نظریات کو بھی بظاہر غالب کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے نیم خواندہ دانشور مغربی افکار و نظریات کے حوالے سے سوچتے اور نتائج کا اسلام پر اطلاق کرتے ہیں۔ یہ بدعت تو بہت ہی عام ہے کہ اسلام کو مغرب سے درآمدہ اصطلاحات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

اسلامی شریعت کی بجائے	اسلامی نظام
اسلام مکمل دین ہے کی بجائے	اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے
دین اسلام کی بجائے	اسلامی آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریہ حیات

دین اور نظام کا فرق تو پہلے زیر بحث آ چکا ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ آئیڈیالوجی کسی بھی طرح دین کا مترادف نہیں، نہ ضابطہ حیات نہ نظام اس کا مترادف ہیں۔ جب کسی لفظ کو دوسرے لفظ سے بدلا جائے تو مفہوم اور مدعا بھی بدل جاتا ہے۔ دین کا پس منظر اور تاریخ الہام اور وحی کے تسلسل میں ملتا ہے۔ جبکہ نظام، آئیڈیالوجی اور ضابطہ حیات تو فلسفے اور سیاست کی دنیا کے الفاظ ہیں اور مغرب کے فلسفیانہ ارتقاء اور علوم سیاسیات کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں۔ آئیڈیالوجی ہیگل کی پیش کردہ اصطلاح ہے اور نظام ISM کا اُردو مترادف۔ مغرب سے درآمدہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصطلاحات کی معرفت گمراہی کی کئی شکلیں سامنے آئی ہیں۔ اس موضوع پر محمد حسن عسکری نے تفصیل سے اور علمی گہرائی سے لکھا ہے۔ محمد اسد بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ اُن کی زیرِ نظر کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ہے ''مصطلحات اور تاریخی نمونہ''

اس باب کے آغاز میں انہوں نے ''مغربی اصطلاحات کا غلط استعمال'' کے ذیلی عنوان کے تحت قلم اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلامی مملکت کے متعلق فکری ابتری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریے کے حامی اور اس کے معترض، دونوں بلا امتیاز مغربی سیاسی مصطلحات وتعریفات اسلامی نظامِ سیاست کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں، حالانکہ اس نظام کا بنیادی تصور سراسر مختلف ہے''۔

یہاں ایک Paradox پیدا ہو گیا ہے کہ مصنف مغربی مصطلحات کے استعمال پر معترض ہیں اور خود بلا جھجک نظریہ اور نظام کی مغربی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کی اظہار کی زبان انگریزی ہے اور بعض مغربی اصطلاحات کا استعمال ان کی مجبوری ہے۔ پھر انگریزی سے اُردو ترجمے میں بات حقیقت سے دور جا پڑی ہے اور یہ ترجمہ در ترجمہ کی مجبوری ہے۔ ہم یہاں مصنف کے پیش کردہ مفہوم اور مراد تک خود کو محدود رکھیں تو بلا تکلف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف اسلام کو مغربی اصطلاحات کے محدود سانچوں میں محدود کرنے کے روادار نہیں، نہ ہی مصنف مغربی اصطلاحات کے منفی پس منظر کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اسی طرح مصنف اس طرح کی تعبیرات کی بلا تکلف تردید کرتے ہیں کہ اسلام جمہوریت ہے یا اشتراکیت یا آمریت۔ مصنف جزئی مشابہت کی بنا پر کسی سطحی قسم کا نتیجہ اخذ کرنے کی ہر کوشش کو نامحمود اور غلط سمجھتے ہیں۔ محمد اسد لکھتے ہیں:

> ''دورِ حاضر کے مسلمانوں کی تصانیف میں بار بار اس قسم کے دعوے پائے جاتے ہیں کہ اسلامی کا مطلب ''جمہوری'' ہے اور اسلام کا نصب العین ایک ''اشتراکی'' معاشرے کا قیام ہے۔ بہت سے مغربی اربابِ قلم اسلام میں نام نہاد ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سیاسی تعریفات کی ایسی سطحی کوششیں محض متضاد ہی نہیں، بلکہ ان میں ایک خطرہ بھی شامل ہے یعنی اسلامی معاشرے کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسائل کو صرف مغربی تاریخی تجربات کے زاویے سے دیکھا جائے اور درست یا قابل اعتراض معاملات کو صرف ناظر کے مشاہدے پر موقوف رکھا جائے"۔

اس تجزیے نے کتنے ہی مفکرین اسلام کی فکر کے تار و پو بکھیر دیے ہیں۔ مغرب کی عینک سے دیکھنے اور مغرب کے معیار پر اسلام کو جانچنے کا نتیجہ فکر و نظر کے زیاں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسلام نہ آمریت ہے، نہ جمہوریت، نہ اشتراکیت، وہ تو صرف اور صرف اسلام ہے۔

ہمارے عہد کے ایک عظیم سکالر ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی یہی نتائج اخذ کیے ہیں۔ انھوں نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

"نظامِ حکومت کیا ہے؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو جب اسلام جائز قرار دیتا ہے تو ان حالات میں ہر دور کے اور ہر ملک کے لوگ باہم مشاورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے کہ ہمیں کون سا طرزِ حکومت اپنے زمانے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ شاید اس بات کی ضرورت سمجھیں کہ میں بتا دوں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ بعض احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکہ سبا، بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا" (۲۷:۳۴) "جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں"۔ اس لیے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے، مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے باداہوں کا ذکر بھی ہے اور برے بادشاہوں کا بھی۔ جہاں ایک طرف فرعون اور نمرود جیسے ظالم بادشاہوں کا ذکر آتا ہے، وہاں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے۔ جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلہ میں آئی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کیے ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے خیال میں بادشاہت مناسب ہے تو اسے اختیار کیجیے۔ آپ کے خیال میں مناسب نہیں ہے تو نہ کیجیے۔ خود ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہی نہیں ساتھ ساتھ بادشاہ بھی رہے ہیں۔"(۱)

محمد اسد اسلام کے اجتماعی نظام میں اس بات کے قائل ہیں کہ قومی مقاصد اور اجتماعی مفاد کے لیے مسلمانوں کے اموال کو قومیایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے مولانا عبیداللہ سندھی کے نقطہ نظر کی مکمل تائید کی ہے اور اُس آیت سے استدلال کیا ہے جس آیت سے مولانا سندھی نے استدلال کیا ہے۔ یعنی

ان اللہ اشترىٰ من المومنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة.

"بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کے نفوس اور اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں"۔

محمد اسد اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو حکومت اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر قائم ہے اور قانونِ اسلام کی پیروی کر رہی ہے، اسے پورا حق حاصل ہے کہ شہریوں کے تمام وسائل جن میں اُن کے ذاتی املاک اور زندگیاں بھی شامل ہیں، قربانی کے لیے طلب کرے"۔

بعینہ یہی بات مولانا عبیداللہ سندھی نے کہی تھی اور مذکورہ آیت کے حوالے سے کہی تھی جس کی تفصیل ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی میں ملتی ہیں۔

محمد اسد کے ہاں جہاد کے سلسلے میں تقریباً وہی موقف ملتا ہے جو انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ رکھنے والوں نے اپنایا تھا یعنی وہ صرف دفاعی اقدام کو قرآن کے حکم جہاد کا مصداق خیال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جارحانہ اقدام کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک بات نظر انداز کر گئے ہیں کہ اسلام کی دعوت کے دو مرکزی نکات میں توحید کے قیام کے ساتھ ساتھ ظلم کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ یہی انسانی فطرت ہے اور انسان کو فطرت کے قریب لانا اور

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور ص ۱۱۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فطرت پر قائم رکھنا ہی دین ہے۔ محمد اسد کا دعویٰ ہے:

''اسلام کسی بھی حالت میں اپنے پیروؤں کو جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں دیتا''

اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو قیصر اور کسریٰ کے خلاف جارحانہ جنگوں کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ یقیناً یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی کا تفسیری لٹریچر گہری بصیرت فراہم کرتا ہے۔

محمد اسد نے ریاست کے فرائض میں مفت اور لازمی تعلیم کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف احادیث سے استدلال کیا ہے۔ یہ نتیجہ فکر تقریباً وہی ہے جو امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نے الہام الرحمٰن اور المقام المحمود میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہ نتیجہ فکر قرآن مجید سے اخذ کیا ہے۔ اسی طرح وہ مسلمان ریاست میں شہریوں کے لیے اقتصادی تحفظ ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس بات میں وہ مولانا حفظ الرحمٰن بیوہاروی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

آخری باب میں محمد اسد نے اسلامی قانون سے بحث کی ہے۔ انھیں یہ بات ناقابل قبول ہے کہ جس ملک میں جس مذہب فقہ کی اکثریت آباد ہو اس فقہی مذہب کو ملک کا قانون قرار دے دیا جائے۔ اس نقطہ نظر پر انہیں دو اعتراضات ہیں:

''اول مروجہ فقہی نظاموں میں سے کوئی بھی موجودہ وقت کی ضروریات کے مطابق نہیں کیونکہ استخراجات بڑی حد تک اُس زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں جو ہمارے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔

دوم یہ بات ناقابل تصور ہے کہ جو مملکت اسلامی ہونے کی مدعی ہے، وہاں وہ فقہ رائج ہو، جو آبادی کے صرف ایک حصے کے نزدیک قابل قبول ہو اور یہ فقہ قوم کی اقلیت پر اس کی مرضی کے خلاف عاید کی جائے۔ یوں اسے سیاسی اعتبار سے بھی اقلیت بنا دیا جائے''۔

یہ وہ اعتراضات ہیں جو اسلامی فقہ سے کماحقہ آگاہ نہ ہونے کا نتیجہ ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ڈاکٹر حمیداللہ منفرد شخصیت ہیں جو اسلامی فقہ سے بھرپور طریقے سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے فقہ اسلامی کی وسعتوں کا سراغ لگایا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ محمد اسد اسلامی فقہ کے وسیع ذخیرے سے پوری طرح شناسائی نہیں رکھتے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جو شخص جس شے سے آگاہ نہ ہو

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُسے پسند نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی اور ڈاکٹر حمید اللہ کے طرزِ فکر کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ مولانا سندھی ایک عالمی شخصیت تھے اور بہت بڑے انقلابی بھی، مگر فقہ حنفی کو اپنے عہد میں قابل عمل، بلکہ واجب التعمیل خیال کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے حکومت ترکیہ سے کہا تھا کہ انہیں ایک دو اضلاع دے دیے جائیں جہاں وہ فقہ حنفی کو رائج کر سکیں پھر دکھا سکیں کہ وہاں کی اخلاقی حالت ملک کے دوسرے حصوں سے کس قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ پر اور اصول فقہ پر تفصیلی کام کیا اور حضرت امام محمد شیبانی کے کارناموں کو جدید عہد کے قاری سے روشناس کرانے میں ان کا کام کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں۔

محمد اسد نے اس کا حل یہ تلاش کیا ہے کہ قرآن مجید کی آیات احکام اور احادیث میں سے احکام کی احادیث کا مجموعہ مرتب کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ یہاں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ احادیث میں بعض جگہ تعارض کی صورت موجود ہے۔ اس کا حل وہ یہ تلاش کرتے ہیں کہ

> ''جن احادیث کی صحت پر معمولی سی گنجائش اعتراض بھی موجود ہو انہیں ابتدا میں ہی الگ کر دینا چاہیے''۔

وہ ان احادیث کو اجتہاد کے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ جن کی صحت میں اعتراض کی گنجائش تو موجود ہے، مگر باقی اعتبارات سے ان میں صحت کے علائم موجود ہیں۔ وہ اس خاص مجموعے کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مصنف کی اس رائے کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم احادیث کے رفع تعارض کے لیے آئمہ مجتہدین کے اصول زیر بحث لائیں اور اُن کے مقابلے میں اس رائے کی قدر و قیمت جاننے کی کوشش کریں، مگر اس مضمون میں اس قدر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔

مصنف کی کتاب کا یہ حصہ پوری کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے۔ یہاں اُن کی بحث علمی گہرائی کی بجائے سطحیت لیے ہوئے ہے۔ انھیں اس مقام پر وہ اُلجھن درپیش ہے جو ہمارے عہد کے عمل بالحدیث کے دعویداروں کو پیش آتی ہے۔ فقہاء تمام صحیح احادیث کو تسلیم کرتے تھے اور جہاں ان میں تعارض ہوتا، وہاں تطبیق کی شکل تلاش کرتے اور جہاں ایسا ممکن نہ ہوتا وہاں قرآن و سنت کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر راہ عمل دریافت کرتے۔ ہمارے ہاں کے عمل بالحدیث کے مدعی بہت سی حدیثوں کا انکار اور ان کی تردید کر کے ایک حدیث پر عمل کرتے ہیں اور یوں ان کا عمل اصحاب الحدیث کا نہیں منکرین حدیث کا ہو جاتا ہے۔ مصنف اس مقام پر اس طرح کا طرزِ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل تو نہیں اپناتے، مگر فقہاء کی عظمت فکر کو پوری طرح نہ پاسکنے کے باعث بعض کمزوریوں کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں۔

محمد اسد نے اس کتاب میں جمہوریت کو اپنایا ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی پہلی جنگ عظیم کے بعد جمہوریت کو اپنانے پر زور دیتے تھے۔ یہی وہ رویہ ہے جو علمائے حق نے بالعموم اپنایا کیونکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے لیے عوامی تحریک شروع کی۔ یہ جمہوری طرز عمل ہے۔ ان علماء نے عدم تشدد کا اصول اپنا کر جمہوریت کو پوری طرح اپنایا اور بہت سے جمہوریت پسندوں سے بڑھ کر جمہوریت پسندی کا ثبوت دیا۔

محمد اسد نے کمال یہ کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی احکام اور اپنے استنباطات کو الگ الگ پیش کیا ہے اور کہیں بھی اپنے استنباط اور تعبیر کو نص کا درجہ نہیں دیا۔ یہ رویہ علمائے حق کے عمومی رویے سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کتاب کا دائرہ کار صرف یہ علمی موضوع ہے کہ مسلمان کس قسم کا نظام اپنائیں اور اس کا نفاذ کیسے کریں۔ کتاب کے مطالعے کے دوران میں دو سوال راقم کے ذہن میں آئے جن کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ پہلا یہ کہ سیاسی نظام مغربی انسان کے لیے اندھے کی لاٹھی ہے۔ یہ اُس کا آخری سہارا ہے۔ اس کے تاریخی ارتقاء کا حاصل ہے اور اس کے معاشی تحفظ کا ذریعہ ہے۔ امریکا میں سیاسی نظام چند لمحوں کے لیے معطل ہو جائے تو ان کی زندگی ایسے ٹوٹ پھوٹ جائے گی جیسے شوٹنگ کے بعد فلم کا سیٹ۔ اُن کا سیاسی نظام اُن کی معیشت کو سہارا بھی دیتا ہے اور دوسری دنیا کے استحصال کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کو امپریلزم نے بہت طاقتور بنا دیا ہے۔ وہاں کا سیاسی نظام اُن کی معاشرت، معیشت، فکر و فلسفہ حتیٰ کہ اخلاقیات اور معاملات میں آخری سہارا بنتا ہے۔ مسلمان ملکوں کو مغربی ممالک کے استبداد سے آزادی حاصل کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہ آزادی بھی کسی انقلابی جنگ یا منظم مقابلے کا نتیجہ نہیں تھی۔ اکثر جگہ حکومتی اعلان آزادی کو آزادی کا نام دیا گیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم دنیا میں بھی سیاسی نظام ویسا ہی کردار ادا کر رہا ہے یا اسے کرنا چاہیے جیسا کہ یہ مغرب میں کردار ادا کر رہا ہے۔ کیا مسلمان معاشرہ کسی سیاسی نظام کو یہ حق دے بھی سکتا ہے یا نہیں۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں قانون سازی کا بہت بڑا کام ریاستی کنٹرول سے باہر آزاد ادارے یعنی فقہائے اُمت سرانجام دیتے رہے اور حکومتی سرپرستی کے بغیر اُن کی قانون سازی کا کام جاری رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ کسی حکومت نے رسمی طور پر اُن کی فقہ کو نافذ کیا یا نہ کیا، عوام نے خلوصِ دل سے اُسے تسلیم کیا۔ پھر یہ فقہ صرف عبادات اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملات تک محدود نہیں ہے، عالمی قانون تک وسیع ہے۔ آج بھی قانونِ بین الاقوام کا مطالعہ کیا جائے تو مسلمان فقہا کا بہت سا کام عالمی قانون کی شکل میں نافذ نظر آتا ہے۔ مسلمان معاشرے میں افتاء کے ادارے نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں مغرب ان سے کاملاً ناآشنا ہے۔ مسلمان معاشرے کے بارے میں جب بھی لکھا جائے گا، افتا کا ادارہ اور اس کی قانونی حیثیت ضرور زیر بحث آئے گی۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ اس کی حیثیت کو کوئی حکومت بدل نہیں سکتی۔ یہ تاریخ تہذیب کا حصہ بن گیا ہے۔ جس طرح کوئی قانون زبان نہیں بدل سکتا۔ جس طرح کوئی قانون ہمیں مادری زبان بولنے سے روک نہیں سکتا، اسی طرح افتاء کے ادارے کو کام کرنے سے اور مسلمان معاشرے کو اس کی اطاعت کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ بحث ہے جس سے اسلام کا نظامِ حکمرانی پر قلم اُٹھانے والوں نے صرفِ نظر کیا ہے۔ بہرحال یہ سوالیہ اس کتاب میں بھی جواب طلب ہی رہتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں ریاست کا کردار اور سیاسی نظام کا کردار کیا ہے اور مغربی معاشرے میں کیا ہے۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بہت ضروری ہے۔

دوسرا سوالیہ جو بہت ہی ضروری ہے، وہ یہ کہ مسلمان معاشروں کو اعلانِ آزادی سے مستفید ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اعلانِ آزادی کے بعد سے اب تک وہ ادارے وہاں حکومت کر رہے ہیں جنھیں مغربی آقاؤں نے اپنے دورِ اقتدار میں جنم دیا، منظم کیا اور جاتے ہوئے انھیں حکومت سونپ دی۔ ان ممالک کا نظامِ تعلیم، نظامِ حکومت، نظامِ معیشت مغرب کا طفیلی اور گماشتہ ہے۔ اسے نیو کالونیل نظام کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان معاشروں کی سب سے بڑی ضرورت اس نیو کالونیل نظام سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس سوال پر مسلمان ملکوں کے مستقبل کا انحصار ہے کہ وہ کس طرح مخصوص طبقات سے اقتدار چھین کر عوام کو اُن کا پیدائشی حق لوٹا دیں۔ علامہ محمد اسد Academic انسان ہیں۔ وہ سماجی تبدیلی کے موضوع کی طرف نہیں آئے۔ شاید اس لیے کہ یہ ان کا موضوع ہی نہیں تھا۔ وہ نظری آدمی ہیں اور ہمارا مسئلہ نظری کے ساتھ ساتھ عملی بھی ہے۔ اس عملی مسئلے کے حل کے لیے بھی بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ سماجی تبدیلی کا ایک ماڈل سوشلسٹ انقلاب کے نام سے متعارف ہوا۔ اب تو یہ ماڈل بھی موجود نہیں۔ اب مسلمان ملکوں، بلکہ تیسری دنیا کے تمام ملکوں کا مسئلہ ہے کہ وہ مل کر سماجی تبدیلی کا وہ ماڈل دریافت کریں جو انھیں مغرب کا طفیلی ہونے سے نجات دلا سکے۔ مغرب کے ساختہ پرداختہ دیمک زدہ ادارے اُس کی آزادی اور نجات کا ضامن بننے سے قاصر ہیں۔ وہ اُس کی غلامی کے بندھن پختہ سے پختہ تر کر سکتے ہیں اور بس۔ یہ دو سوالیہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برسبیل تذکرہ نوک قلم پر آ گئے تاکہ سماجی علوم کے محققین ان پر غور وفکر کر سکیں۔

راقم الحروف نے کتاب ہذا کے تجزیے میں معروضیت کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور تعصب سے حتی الوسع خود کو بچائے رکھا ہے۔ اگر کہیں کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معافی کا خواستگار ہے۔

زیر نظر کتاب کا ترجمہ مولانا غلام رسول مہر نے کیا ہے۔ ترجمہ رواں اور سلیس ہے، مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مصنف پیدائشی طور پر مغربی ہے اور اُس کی مادری زبان جرمن ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس میں فقرے کی ساخت اُردو بولنے والے فرد کے ذہن کی بجائے مغربی زبان بولنے والے شخص کے ذہن سے کی گئی۔ اس کا محاورہ اور انداز مغربی ہے۔ اسے اُردو میں ترجمہ کیا گیا تو مترجم کی لیاقت اور قابلیت کے باوجود اس کی عبارت اُردو کے قاری سے بعض مقامات پر کم مانوس محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں حواشی بھی قلمبند کیے ہیں۔ راقم نے جہاں کہیں مصنف یا مترجم سے اختلاف کی ضرورت محسوس کی ہے، اس کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔ اس کے باوجود کتاب کے متن اور مترجم کے حواشی کو پوری دیانتداری سے پیش کیا ہے۔ راقم کی چند آراء بعض مقامات پر حواشی پر درج ہیں۔ ان کے ساتھ وضاحت کے لیے مدیر کا حوالہ دیا گیا ہے تاکہ انھیں مصنف اور مترجم کی آراء سے الگ شناخت کیا جا سکے۔ اُمید ہے ہماری یہ کاوش اہل علم سے خراج تحسین وصول کرے گی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

والسلام

امجد علی شاکر

۲۰ رصفر المصفر ۱۴۲۷ھ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

از پروفیسر گرونے باؤم

تاریخ یا اجتماعی علوم کے دائرے میں بالعموم کوئی بیان یک گونہ ابہام سے محفوظ نہیں رہ سکتا جو تاریخی ادراک میں مضمر ہے' اگرچہ وہ بیان مفہوم کے اعتبار سے کتنا ہی تحلیلی ہو اور اس کے لیے اسناد کی فراہمی میں کتنی ہی احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ ایسے بیانات میں حقائق اور لائحہ ہائے عمل بھی پیش کیے جاتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اس ذہنی تاریخ کا سرچشمہ بن جاتے ہیں جو ابھی لکھی نہیں گئی۔ عموماً بے تکلفی سے الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ کوئی مؤرخ اپنے آپ کو تعصب سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ الزام بالعموم اس لیے لگایا جاتا ہے کہ اضطراب افزا بصیرت کی قدر و قیمت زائل کی جائے۔ اس الزام کے بجائے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہر مصنف کی انتہائی آرزو کا اندازہ متعلقہ حقائق کی فراہمی اور ان سے کام لینے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔

ممکن ہے' انتہائی آرزو مخفی یا مضمر رہے۔ الماوردی (وفات ۱۰۵۸ھ) نے اسلامی مملکت کے نظام کے متعلق جو جامع بیان مدون کیا تھا' وہ مصنف کی وفات سے کچھ کم نو سو سال بعد روشنی میں آیا' اگرچہ اس کے معاصروں کو وقتی حالات سے ماوردی کے نظریات کی مطابقت ہی نہیں' بلکہ خلافت کے سلسلے میں عملی پروگرام کی اہمیت سے بھی آگاہی تھی۔ تاریخ یا سیاسی علم کے متعلق کسی کتاب کا وظیفہ مختلف وقت' ماحول اور تہذیب کے سلسلہ میں مختلف ہو سکتا ہے۔ مغربی قارئین کے نزدیک ماوردی کے نظریات کاروبار مملکت کے سلسلے میں اصلاً اسلامی افکار کی اک دستاویز ہیں۔ اس اعتبار سے اسے اجتماعی تنظیم کے مسئلے تک قطعی رسائی کے مطالعے کے لیے ایک معروضی اور خارجی ماخذ سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے اسے اس رسائی کی ترتیب یا ترمیم کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلسلے میں اک منشور سمجھا گیا ہو۔

اسی طرح مسٹر اسد نے ''اسلامی حکومت اور مملکت کے اصول''[1] کے متعلق جو کچھ لکھا ہے' اس کی اہمیت بھی دوگونہ ہے۔ ماوردی کے ''الاحکام السلطانیہ'' کے برعکس اس کتاب کو واضح طور پر ایک پروگرام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر اسد فرماتے ہیں کہ یہ مرحلہ ایسا ہے جس میں ملل اسلامیہ کو اپنی تقدیر کے آزادانہ انتخاب کی رخصت دے دی گئی ہے۔ وہ آج حقیقی معنی میں اسلامی نظام سیاسیات پر قائم ہو سکتی ہیں۔ شاید یہ موقع دوبارہ نہ آئے۔ اس یگانہ فرصت کی تیزروی کے احساس سے متاثر ہو کر مسٹر اسد نے اسلامی مملکت کے متعلق اپنے تصورات پیش کر دیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان کی بنا پر ایک قابل عمل اصول نامہ خاصی تفصیل سے مرتب کر دیں۔ ان کے آراء اسلامی استدلال کے مسلمہ مآخذ یعنی قرآنی الہام اور سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات) پر مبنی ہیں' تاہم اسلامی مملکت کا یہی تصور نہیں جو پیش نظر ہے' لہٰذا اس نقطۂ نگاہ سے مسٹر اسد کے پروگرام کی مطلقیت اور ذہنی خود اختیاری ختم ہو جاتی ہے اور وہ ان متصادم نظریات تموجات کی متعدد شہادتوں میں سے ایک شہادت رہ جاتا ہے' جن کا ظہور اسلامی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ اس کتاب کی دوگونہ اہمیت ہمارے لیے اس وجہ سے بہ طور خاص بڑھ جاتی ہے کہ مسٹر اسد نے جو نظریات پیش کیے' وہ مسلمانوں کے ایک بڑے اور ذی اثر طبقے کے نظریات ہیں۔

مسٹر اسد کے افکار پیغام اسلام کی معروضی اور عالمگیر طور پر مسلمہ تعبیر کے مطابق ہیں' لیکن موصوف جن عوام کو متاثر کرنا چاہتے ہیں' وہ مسلمانوں میں' خصوصاً پاکستان کے وہ اسلامی حلقے جو سیاسی اعتبار سے خود آگاہ ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر مسٹر اسد نے ایک خاص طریق عمل اور ایک خاص اسلوب اظہار اختیار کیا۔ یہ ایسے ماحول میں بروئے کار آیا۔ جسے ایک مغربی خوانندہ کتاب کسی حد تک غیر معمولی سمجھ سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کے تاریخی ادراک کے بعد مسٹر اسد کے عوام کو غالباً ہمارے مقابلے میں سہو زمانی کا کم احساس ہو۔ کسی دلیل کے دل

1- The Principles of State and Goverment in Islam.

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نقیض اثبات کے لیے الہامی متن پر انحصار انتخاب وتعبیر کی ایسی تحریک کا موجب بنتا ہے، جس سے مغرب میں سائنس اور مذہب کے مابین ایک دو صدی پیشتر تو متعارف تھے، لیکن آج کل بعض اوقات یہ تکنیک من مانی اور غیر مستند معلوم ہوتی ہے۔ مغربی قارئین کو یاد رکھنا چاہیے کہ جدید رجحانات اور جدید افکار کی توثیق کے لیے صحائف سماوی اور متعلقہ معلومات کی تعبیر نو معاشرے کے ذہنی ڈھانچے میں سند اور آزادی کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یوں یہ کتاب بہ یک وقت تین سطحوں پر پڑھی جانی چاہیے۔

اولاً یہ ایک توضیحی دستاویز ہے اور اس میں مملکت کا وہ نظریہ پیش کیا گیا ہے، جسے مصنف لازم قرار دیتا ہے۔ گویا یہ فرد اور معاشرے کے فرائض کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے جو قرآن و حدیث کے رو سے غیر متبدل ہیں۔ مغربی قارئین کے نزدیک اس کتاب میں دور حاضر کے مغرب کے سیاسی افکار اور اسلامی روایات کی میراث کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ محض توضیحی نہیں، بلکہ اعتقادی دستاویز بھی ہے۔ اسے کیلون کے ضوابط یا کیمونسٹوں کے منشور کی صف میں رکھنا چاہیے۔

لیکن یہ موجودہ اسلامی یا زیادہ تعین سے کہنا چاہیے پاکستانی فکر ونظر کی ایک اہم دستاویز ہے، جس کا تعلق ایک فوری اور عملی ضرورت سے ہے۔ درحقیقت اسے ایک غیر معمولی طور پر خوش ترتیب اور خوش اسلوب بیان اس نقطہ نگاہ کے متعلق سمجھنا چاہیے، جو ماضی قریب تک عربی بولنے والے ملکوں نیز پاکستان کے تعلیم یافتہ اور اسلام کے بہی خواہ علماء میں رائج رہا۔

سب سے آخر میں یہ کہ اس دستاویز میں مغربیت کا ایک پہلو منعکس ہے، یعنی دو روایتوں کے درمیان کم وبیش عمداً تطابق پیدا کرنا۔ یہ تطابق صرف سیاسی تمناؤں ہی تک محدود نہیں، بلکہ خواندہ کے سامنے پیش کرنے کے طریقہ میں بھی نمایاں ہے۔ جسے یہ یقین دلانا منظور ہے، یہ روایتی مفروضات طبعاً دور حاضر کے نتائج پر پہنچاتے ہیں اور یہ نتائج اس مذہبی پیغام کے حقیقی مفاد کی انتہا ہیں، جس سے اسلامی میراث نے نشوونما پایا۔ اسلوب بیان ایسا رکھا گیا ہے جو قدامت پسند مومن کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہے۔ ساتھ ہی اسلامی الہام کی لامتناہی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثروت بے نقاب کی گئی ہے اور مغربی میراث کے بہترین عناصر کے مبادی بھی اس میں شامل قرار دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب حاجی انیس الرحمٰن میموریل سوسائٹی [1]، کراچی (پاکستان) کی سرپرستی میں مرتب ہوئی اور سوسائٹی ہی کے ایماء سے کیلیفورنیا یونیورسٹی لاس انجلیز کے مرکز مشرق قریب نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ سوسائٹی کی یہ خواہش، کہ اسے مغرب میں شائع کیا جائے، اس کتاب اور متعلقہ مسائل کی ماورائے ثقافت اہمیت کا ثبوت ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنے کے سلسلے میں مرکز مشرق قریب [2] کی ادارتی پالیسی کے متعلق اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو یہ ہے کہ سائنٹفک فکر مختلف صورتوں میں جو متعدد وظائف وعوامل اختیار کر سکتا ہے، ہمیں اس کا پورا احساس ہے۔ ہم آئندہ بھی ایسی کتابیں شائع کرتے رہیں گے، تاکہ تحقیق وتجسس اور دستاویزوں کے پیش کرنے کے علمی سلسلے کو تقویت پہنچے۔ ساتھ ہی ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کسی خاص کتاب کی حیثیت زیادہ تر اس کے ثقافتی ماحول پر منحصر رہے گی؛ جس سے اس کا تعلق ہے۔

(جی ای فان گرونے باوم ڈائرکٹر) [3]

مرکز مشرق قریب، کیلیفورنیا یونیورسٹی لاس انجلیز

1-Haji Anisur Rahman memorial Society.

2- Near Eastern Center university of California los Angeles.

3- G.E. Von Crunebaum

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

یہ کتاب ان افکار کے نشو وارتقاء پر مشتمل ہے' جو میں نے اپنے ایک مقالے ''اسلامی دستور سازی'' میں پیش کیے تھے۔ یہ مقالہ حکومت کے زیر سرپرستی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا (مارچ ۱۹۴۸ء)۔ میں اس زمانے میں اسلامی تعمیر نو کے محکمے کا ناظم (ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ اسلامک ری کنسٹرکشن) تھا۔ یہ ایک سرکاری ادارہ تھا' جس کا مدعا یہ تھا کہ ان ذہنی اور اجتماعی اصول کی تفصیلات مدون کی جائیں جو ہمارے نئے معاشرے اور نئی مملکت کی بنیاد و اساس ہوں گے۔ جو مسائل میرے دل و دماغ پر حد درجہ چھائے ہوئے تھے' طبعًا ان میں سے ایک مسئلہ پاکستان کے آئندہ دستور کا بھی تھا۔ اس زمانے میں بھی ہر شخص پر یہ امر واضح نہ تھا کہ دستور کی وضع و ہیئت کیا ہونی چاہیے اور آج بھی واضح نہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک کے باشندوں کی اکثریت حقیقی اسلامی مملکت کے تصور سے سرتاپا متاثر تھیں، یعنی چاہتی تھی کہ ایک مملکت (مروجہ سیاسی گروہ بندیوں سے بالکل الگ رہ کر) نسل وقومیت کے تصورات پر نہیں، بلکہ خالصۃً قرآن وسنت کے نظریات پر تعمیر کی جائے۔ تاہم کسی کو مثبت انداز میں معلوم نہ تھا کہ اس حکومت اور اس کے اداروں کے اوضاع واطوار کیا ہونے چاہئیں' جو عملاً واضح طور پر اسلامی ہوگی' ساتھ ہی دور حاضر کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کر سکے گی۔ آبادی کے بعض عناصر سادہ لوحی سے مسلم سمجھے بیٹھے تھے کہ حقیقی اسلامی حکومت بننے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کا نظام ابتدائی عہد کی خلافت کے عین مطابق ہو۔ رئیس مملکت کو تقریباً وہی آمرانہ (۱)

۱۔ مصنف کی مراد خلافت کے وسیع اختیارات اور تمام ریاستی اداروں کی بااختیار سربراہی ہے۔ (مدیر)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختیارات سونپ دیے جائیں۔ تمام اجتماعی اوضاع میں (ان میں عورتوں کی کم و بیش کامل علیحدگی بھی شامل ہو) قدامت پسندی قائم رکھی جائے۔ ویسا ہی بالکل ابتدائی دور کا اقتصادی نظام بیسویں صدی کے پر پیچ سلسلہ نظم ونسق مالیات کی جگہ لے لے۔ سب سے آخر میں دور حاضر کی فلاحی مملکت کے تمام مسائل صرف ایک محصول یعنی محصول زکوۃ کی بنا پر حل ہو جائیں گے۔ دوسرے طبقے ـــ یہ لوگ زیادہ حقیقت پسند تھے' لیکن اسلام کو اجتماعی زندگی میں ایک کارفرما عامل بنا لینے سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ـــ یہ تصور کیے بیٹھے تھے کہ پاکستان کا نشوو ارتقاء انہیں اصول پر ہوگا' جنہیں دور حاضر کے مغرب کی پارلیمانی جمہوریتوں میں مشترکاً درست ومعقول مانا جاتا ہے اور ان دونوں میں بجز اس کے کوئی فرق نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں دستور میں رسماً لکھ دیا جائے گا' مملکت کا مذہب اسلام ہے اور آبادی کی بہت بڑی اکثریت کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ایک وزارت امور مذہبی قائم کر دی جائے گی۔

افراط وتفریط کے ان دو نظریوں کے درمیان توافق پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ ضرورت ایسے دستوری خاکے کی تھی' جو ایک طرف حقیقی معنی میں اسلامی ہوتا اور دوسری طرف ہمارے عہد کے تمام عملی تقاضوں کو اس میں پیش نظر رکھا جاتا۔ ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ اسلام کا اجتماعی نظام تمام ادوار اور انسانی نشوو ارتقاء کے تمام مراحل کے لیے صحیح جواب مہیا کرتا ہے۔ اس عقیدے کو حق بجانب ثابت کرنے کی یہی صورت تھی کہ ہم مذکورہ بالا وضع کا ایک دستور پیش کر دیتے' لیکن اسلامی کتابوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے تھا' اس میں ہماری اس مشکل کے لیے رہنمائی کا کوئی سامان نہ تھا۔ گزشتہ صدیوں کے بعض علمائے اسلام نے ـــ خصوصاً عباسیوں کے عہد حکومت میں ـــ اسلام کے سیاسی قانون پر چند کتابیں مرتب کی تھیں؛ لیکن ان مسائل کے متعلق ان کا طریق فکر ونظر ان کے عہد کے ثقافتی ماحول اور اجتماعی وسیاسی تقاضوں پر مبنی تھا۔ یوں ان کی محنت ومشقت کے نتائج بیسویں صدی کی ایک اسلامی مملکت کی ضرورتوں کا جواب نہیں بن سکتے تھے۔ دور حاضر میں اس موضوع پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھیں' ان میں عموماً دور حاضر کے یورپ کے سیاسی تصورات' ادارات اور حکمرانی کے طور طریقے بے تکلفی سے قبول

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر لیے گئے تھے اور انہیں دور حاضر کی اسلامی مملکت کا معیار بنایا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف امور میں ان مصنفوں نے بہت سے ایسے تصورات اختیار کر لیے' جو اسلامی نظریات کے حقیقی تقاضوں سے بالکل متناقض تھے۔

غرض ہمارے معاصرین یا پیشروؤں کی تصانیف کوئی اطمینان بخش فکری بنیاد مہیا نہیں کرتی تھیں' جس پر پاکستان کی نئی مملکت کی عمارت قائم کی جاتی۔ میرے لیے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ قانون اسلام کے ابتدائی مآخذ ـــ قرآن وسنت ـــ کی طرف متوجہ ہوتا اور اس طرح پاکستان کے آئندہ دستور کے لیے مثبت اصول اخذ کرتا' جو اسلامی مملکت کے موضوع پر مرتبہ کتابوں سے بالکل مختلف ہوتے۔ اس مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں' میں نے اسلامی دستور کا ایک نظری خاکہ تیار کر دینے کا فیصلہ کیا' جو قرآن اور صحیح احادیث کے واضح سیاسی احکام پر مبنی ہوتا۔ اس ضمن میں مجھے قرآن' احادیث اور اصول فقہ کے اس مطالعے سے بڑی مدد ملی' جو میں پیشتر کر چکا تھا۔ اس خاکے کے بنیادی اصول قرآن نے مہیا کیے۔ اکثر متعلقہ تفصیلات اور ان کے اطلاق کا طریقہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ستر ارشادات سے اخذ کیا' جو ملی زندگی کے مختلف سیاسی و اجتماعی پہلوؤں پر مشتمل تھے۔ انہیں کوششوں کا نتیجہ "اسلامی دستور سازی" پر وہ طویل مقالہ تھا' جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ خاص سیاسی حالات کے باعث' جن پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں' اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے سلسلے میں میری نہایت کم تجاویز سے فائدہ اٹھایا گیا' بلکہ کہنا چاہیے' غالباً اس تمہید میں میری تجاویز کی صدا سنی جا سکتی ہے' جسے دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں منظور کیا تھا[1]۔"

اب دس سال کے افسوسناک تجربات سے ہم گزر چکے ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کا مسئلہ تاحال حل نہیں ہوا' لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ ایک اسلامی مملکت کے دستور میں جو اصول کارفرما ہونے چاہئیں' ان پر غور و بحث کا افادی حیثیت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا' بلکہ اس حقیقت کے پیش نظر اس بحث کا جاری رکھنا حد درجہ ضروری ہو گیا ہے۔ موجودہ مسلم ممالک میں

ـــــــــــــــ

۱۔ اس سے مقصود "قرارداد مقاصد" ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کوئی بھی اب تک حکومت کی وہ شکل اختیار نہیں کر سکا' جسے واقعی اسلامی کہا جا سکے۔ یہ غور و بحث کم از کم ان قوموں کے لیے بہت ضروری ہے' جن کی زندگی میں اسلام کو ایک محکم حقیقت کی حیثیت حاصل ہے۔ پیش نظر کتاب کا مقصد یہ ہے کہ وہ غور و بحث جاری رہے۔ میں جن نتائج پر پہنچا' ان میں سے بعض کے متعلق اختلاف پیدا ہونا ناگریز ہے' لیکن میرا عقیدہ یہ رہا ہے۔۔۔ اور آج میں اس میں زیادہ پختہ ہو گیا ہوں' ۔۔۔ کہ حرکت انگیز تصادم آراء کے بغیر اسلامی معاشرے میں ذہنی ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد:

اختلاف علماء امّتي رحمة.

میری امت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت کا نشان ہے۔

کی مثبت تخلیقی قدر و قیمت ہے' جسے اسلامی تاریخ میں نظر انداز کیا جاتا رہا اور اس سے مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کو نقصان پہنچا۔

میں حاجی انیس الرحمٰن میموریل سوسائٹی' کراچی کا شکریہ بہ صمیم قلب ادا کیے بغیر یہ دیباچہ ختم نہیں کر سکتا۔ اسی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے مجھے یہ کتاب اپنے پاکستانی بھائیوں کے روبرو پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

محمد اسد

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب:

پیش نظر مسئلہ

اسلامی ریاست کیوں؟

ہر قوم کی زندگی میں زود یا بدیر ایسا وقت آ جاتا ہے' جب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی تقدیر کے آزادانہ انتخاب کا موقع مل گیا ہے' یعنی ایسے فیصلوں کا موقع کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے اور اس کا نصب العین کیا ہو؟ وہ مخالف احوال وظروف کے دباؤ سے آزاد نظر آتی ہے اور اسے کوئی ایک راستہ انتخاب کر لینے سے دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ ایسے تاریخی اوقات ولمحات نہایت کم پیش آتے ہیں اور انتہائی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوم ایسے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو اغلب ہے کہ آئندہ کے لیے صدیوں تک ایسی کوئی مہلت اسے مل ہی نہ سکے۔

آزادانہ انتخاب کا یہ وقت عالم اسلام کے ملکوں کے لیے آ گیا ہے۔ وہ ایک صدی تک جدوجہد کرتے رہے۔ امیدوں' غلطیوں اور مایوسیوں کے طوفانوں سے گزرے۔ آخران اکثر ملکوں کو سامراجی حکومت سے پوری آزادی مل گئی' جہاں مسلمان آباد ہیں۔ آزادی کے حصول نے یہ مسئلہ حددرجہ اہم بنا دیا ہے کہ وہ کون سے بنیادی اصول ہیں' جن کی پابندی کرتے ہوئے عوام کی راحت و بہبود یقینی ہو جائے گی۔ یہ محض انتظامی صلاحیت ہی کا مسئلہ نہیں' بلکہ نظریاتی مسئلہ بھی ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کا کام ہے کہ آیا آزادشدہ مملکتوں کو دور حاضر کے مغربی تصورات کے تحت رکھا جائے' جن میں مذہب کو قوم کی عملی زندگی کی تشکیل کا حق حاصل نہیں' یا انہیں بہر حال حقیقی معنی میں اسلامی نظام واساس کے تابع آ جانا چاہیے۔ کسی مملکت میں اسلامی آبادی کی بھاری اکثریت یا کاملاً اسلامی آبادی کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ اسلامی مملکت ہے۔ ہر مملکت اسی وقت حقیقی اسلامی مملکت بنتی ہے' جب قوم کی زندگی کے لیے اسلام کے سیاسی و عمرانی اصول قصد واہتمام سے نافذ کیے جاتے ہیں اور جب وہ اصول ملک کے بنیادی دستور میں شامل ہو جاتے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوال کیا جا سکتا ہے' کیا اسلام واقعی متوقع ہے کہ مسلمان ہر وقت اور ہر حالت میں اسلامی مملکت کے قیام کے لیے کوشاں رہیں یا کیا یہ خواہش صرف ان کی تاریخی روایات پر مبنی ہے؟ کیا اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے پیرو سیاسی اور اجتماعی اعمال میں ایک خاص مسلک و مشرب کے پابند رہیں یا وہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح پیرووں کو یہ آزادی دیتا ہے کہ تمام سیاسی اقدامات کا فیصلہ وقت کے تقاضوں کی روشنی میں وہ خود کر لیا کریں؟ مقصود یہ ہے کہ آیا مذہب و سیاسیات کو ملائے رکھنا اسلام کا حقیقی بنیادی اصول ہے یا نہیں؟

اسلامی تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مذہب و سیاسیات کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دور حاضر کے مغربی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے لیے یہ گہرا تعلق ایک حد تک ناخوشگوار ہے' کیونکہ وہ عقائد اور عملی زندگی کے مسائل کو کاملاً جداگانہ دائروں میں سمجھنے اور رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی اہمیت کا اس وقت تک صحیح اندازہ ہو ہی نہیں سکتا' جب تک اس مسئلے پر پوری طرح غور نہ کر لیا جائے۔ تعلیمات اسلام سے کسی شخص کی واقفیت کتنی ہی سطحی کیوں نہ ہو' تاہم وہ جانتا ہے کہ یہ تعلیمات صرف خدا سے انسان کے تعلق ہی پر حاوی نہیں' بلکہ اس تعلق کے نتیجے میں اسے جو اجتماعی روش اختیار کرنی چاہیے' اس کے باب میں بھی ایک قطعی نظام طے کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کا بنیادی اصول موضوعہ یہ ہے کہ طبعی زندگی کے تمام احوال وظروف ارادہ باری تعالیٰ کے تابع ہیں' لہٰذا ان کی ایک مستقل قدر و قیمت ہے۔ اسی طرح تخلیق کی یہ علت غائی بھی بدرجہ کمال واضح کر دی کہ مخلوق کو ارادہ خالق کے تابع رہنا چاہیے۔ انسان کے تعلق میں اس تابعیت ـــ جسے اسلام کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے ـــ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خواہشات اور کردار عمداً اور عملاً زندگی کے ان قوانین کے مطابق رہیں' جن کا فیصلہ خالق نے فرما دیا ہے۔ اس تقاضے میں ـــ کم از کم اس حد تک' جس حد تک انسانی زندگی کا تعلق ہے ـــ تصورات حق و باطل کے معنی وہ ہیں' جو ہر معاملے میں اور ہر وقت تبدیل نہیں ہوتے' بلکہ تمام اوقات و احوال میں استوار و پائدار رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے علم و نظر کی بنا پر حق و باطل کی جو تعبیرات کریں گے' ان میں ویسی ابدی استواری پیدا نہیں ہو سکتی' کیونکہ انسانی فکر اساساً موضوعی ہے اور اس پر مفکر کے وقت و ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے' لہٰذا اگر مذہب کا مقصد و مدعا حقیقتاً یہی ہے کہ انسانی خواہشات و اعمال کو ارادہ باری تعالیٰ کے عین مطابق رکھا جائے تو اسے غیر مشتبہ طریق پر بتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دینا چاہیے کہ نیک و بد کے درمیان امتیاز کی کیا صورت ہے؟ یعنی یہ بتا دینا چاہیے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؟ محض عام اخلاقی تعلیمات ۔۔۔ مثلاً ''ہم جنسوں سے محبت کرو'' ''راستبازی کے پابند رہو'' ''خدا پر بھروسا رکھو'' کافی نہیں، کیونکہ ان کی بے شمار تعبیرات ہوسکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے پختہ قوانین کا انتظام ہو جائے' جن میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں ۔۔۔ روحانی وجسمانی' انفرادی واجتماعی' اقتصادی وسیاسی ۔۔۔ کا خاکہ سامنے آجائے' خواہ وہ کتنا ہی سرسری سا ہو۔

اسلام نے الٰہی قانون کے ذریعے سے، جسے شریعت کہتے ہیں، یہ ضرورت پوری کردی ہے۔ قرآن مجید نے خاص احکام مہیا کر دیے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات کے ایک مجموعے کی شکل میں' جسے سنت یا طریق حیات کہتے ہیں' ان کی تفصیل وتفسیر فرمادی' نیز نظائر مہیا کر دیے۔ مومن کے نقطۂ نگاہ سے قرآن وسنت ہمارے لیے تخلیق کے ہمہ گیر خدائی منصوبے کو ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں' جو قابل فہم ہے۔ انسان کے تعلق میں وہ (قرآن و سنت) خدا کی رضا کا تنہا مثبت اظہار ہیں کہ انسان کو کیسا ہونا اور کیا کرنا چاہیے؟

مگر یہ اس کے ارادے کا صرف اظہار ہے۔ وہ ہمیں اس پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ اس نے ہمیں انتخاب کی آزادی دے رکھی ہے۔ ہم چاہیں تو خوشی سے اس کے الہامی قانون کے فرمانبردار بن سکتے ہیں' گویا خدا سے تعاون کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو اس کے خلاف جا سکتے ہیں یعنی خدا کے قانون کو ٹھکرا سکتے ہیں، مگر نتائج کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ ہم جو کچھ بھی کریں' ذمہ داری ہماری ہوگی۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اسلامی زندگی بسر کرنا چاہیں تو ہمیں پہلا راستہ انتخاب کرنا ہوگا۔ بہ ایں ہمہ اگر ہم خدا کی فرمانبرداری کا فیصلہ بھی کرلیں تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ پوری فرمانبرداری کر سکیں' اگرچہ ظاہر ہے کہ اسلامی قانون کا حقیقی مدعا انفرادی اعتبار سے انسان کی راستبازی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قانون کا بڑا حصہ صرف اسی صورت میں مؤثر ہوسکتا ہے' جب بہت سے افراد عمداً اس کے لیے متحدہ کوشش کریں' یعنی یہ کوشش اجتماعی ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کی نیت کتنی ہی نیک ہو' وہ اپنی نجی زندگی کو اس وقت تک اسلامی تقاضوں کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا' جب تک کہ گردو پیش کا معاشرہ عملی معاملات میں اسوۂ اسلام کی تابعیت پر متفق نہ ہو جائے۔ اس قسم کا شعوری تعاون اخوت کے محض احساس سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اخوت کا یہ تصور مثبت اجتماعی عمل میں منتقل ہونا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطلب یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) یا دوسرے لفظوں میں ایسے اجتماعی حالات پیدا کیے جائیں اور انہیں قائم رکھا جائے، جن میں انسانوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہم آہنگی، آزادی اور عزووقار کی زندگی بسر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کے خلاف روش اختیار کر لے تو دوسرے لوگوں کے لیے بھی نصب العین تک پہنچنے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ایسے سرکشوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، باقی لوگوں کی مشکلات اتنی ہی بڑھ جائیں گی۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مطابق قوم کا عزم تعاون اس وقت تک زیادہ تر نظری ہی رہے گا، جب تک کوئی دنیوی قوت قوم کے ایک حصے کی طرف سے اسلامی قانون کے نفاذ اور سرکشی کے انسداد کی ذمہ دار نہ بن جائے۔۔۔۔۔ کم از کم اجتماعی معاملات میں۔ یہ ذمہ داری کسی منظم ادارے ہی کی طرف سے پوری کی جا سکتی ہے، جسے امر اور نہی یعنی حکم اور ممانعت کے اختیارات حاصل ہوں۔ اس سے مراد مملکت ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی مملکت یا مملکتوں کی تنظیم اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لیے ایک ناگزیر شرط ہے۔

''سیکولر'' ریاست کیوں نہیں؟

بے شک وشبہ بے شمار مسلمانوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق اجتماعی وسیاسی نشو وارتقاء کا انتظام ہو۔ اسی طرح موجودہ دنیا کی ذہنی فضا میں بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک یہ تقریباً بدیہی ہو گیا ہے کہ مذہب کو سیاسی زندگی میں مداخلت کا موقع نہ دینا چاہیے۔ سیکولرزم کا اصول خود بخود ''ترقی'' کا مترادف بن گیا ہے اور مذہب کے تحت عملی سیاسیات نیز اجتماعی واقتصادی منصوبہ بندی پر غور وفکر کو رجعت پسندی یا ناقابل عمل مثالیت قرار دے کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ آج بظاہر اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی رائے یہی ہے اور ہماری معاصرانہ زندگی کے دوسرے بہت سے پہلوؤں کی طرح اس سلسلے میں بھی مغربی افکار کا اثر غیر مشتبہ ہے۔

اہل مغرب خاص وجوہ کی بنا پر مذہب سے (یعنی اپنے مذہب سے) بیزار ہیں اور یہ بیزاری اس اخلاقی، عمرانی اور سیاسی ابتری میں منعکس ہو رہی ہے، جو دنیا کے بہت بڑے حصے پر مسلط ہے۔ اپنے فیصلوں اور اعمال کو کسی اخلاقی قانون کی کسوٹی کے حوالے کرنے کے بجائے جو ہر اعلیٰ مذہب کا حقیقی مقصد ہے۔ یہ لوگ وقتی مصلحت (لفظ کی وقتی تعبیر وتخصیص کے اعتبار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے) کو عام معاملات میں واجبات کی تنہا بنیاد مانتے ہیں۔ چونکہ وقتی مصلحت کے متعلق ہر گروہ' قوم اور جماعت کی تعبیرات وافکار مختلف ہیں' اس لیے سیاسی دائرے میں' خواہ وہ قومی ہو یا بین الاقوامی' اغراض ومفاد کی حد درجہ حیرت انگیز کشمکش بپا ہو گئی ہے' کیونکہ بظاہر جو چیز ایک گروہ یا ایک قوم کو خاص عملی نقطۂ نگاہ سے قرین مصلحت نظر آتی ہے' ضروری نہیں کہ وہ دوسرے گروہ اور قوم کے نزدیک بھی قرین مصلحت ہو' لہٰذا جب تک انسان اپنی کوششیں کسی اخلاقی مصلحت کے تابع نہ رکھیں' ان کے جداگانہ مفاد میں کسی نہ کسی نقطے پر تصادم ناگزیر ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف جتنی کشمکش جاری رکھیں گے' ان کے اغراض ومفاد کی خلیج وسیع تر ہوتی جائے گی۔ ساتھ ہی انسانوں کے تعلق میں نیکی اور برائی کے متعلق ان کے افکار میں بھی زیادہ سے زیادہ مزاحمت پیدا ہوتی جائے گی۔

غرض دور حاضر کی سیکولر مملکت میں کوئی ایسا مستقل معیار موجود نہیں' جس کی بنا پر حق و باطل اور نیک وبد کے درمیان فیصلہ کیا جاسکے۔ صرف ایک معیار ممکن سمجھا جاسکتا ہے اور وہ ہے ''قومی مفاد'' لیکن اخلاقی اقدار کا کوئی ایک معروضی دخارجی معیار موجود نہ ہو تو لوگوں کے مختلف گروہ ۔۔۔ بلکہ ایک قوم کے مختلف احزاب ۔۔۔ کے آراء ونظریات بھی قوم کے بہترین مفاد کے بارے میں مختلف ہوسکتے ہیں اور عموماً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار کا عقیدہ اخلاص کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اقتصادی آزادی کی جگہ اشتراکیت نے لے لی تو تہذیب برباد ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اشتراکی کا نظریہ پوری راست بازی کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے کہ تہذیب کی بقا سرمایہ داری کی تنسیخ اور اشتراکیت کے غلبے پر موقوف ہے۔ دونوں اپنے اپنے نظریات کو اخلاقی رنگ میں پیش کرتے ہیں' یعنی یہ کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔ دونوں انسانوں کے متعلق اپنے اپنے اقتصادی نظریات پر قائم ہیں اور دونوں کے باہمی تعلقات میں کشیدگی موجود ہے۔

یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ معاصر مغربی سیاسی نظاموں ۔۔۔ اقتصادی آزادی' اشتمالیت (کمیونزم)' قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم) عمرانی جمہوریت وغیرہ ۔۔۔ میں سے کوئی بھی اس کشیدگی اور ابتری کو کسی ایسی چیز میں تبدیل نہیں کر سکا' جو نظم سے مشابہ ہو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کسی نے بھی سیاسی اور عمرانی مسائل پر مستقل اخلاقی اصول کی روشنی میں غور کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس ان میں سے ہر نظام میں نیکی اور بدی کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصور کی بنیاد اس طبقے یا اُس طبقے' اُس گروہ یا اُس گروہ یا قوم کے مفروضہ مفاد پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنیاد لوگوں کی بدل جانے والی مادی ترجیحات پر مبنی ہے اور وہ مسلسل بدل رہی ہیں۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ انسانی معاملات کی یہی طبعی اور۔۔۔ مطلوب۔۔۔ حالت ہے تو ہم ضمناً یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ نیکی اور بدی کی اصطلاحات کا مستقل مفہوم کوئی نہیں' بلکہ یہ ایسے افسانے ہیں' جو ہم نے سہولت کے خیال سے تیار کر رکھے ہیں اور یہ افسانے وقت اور عمرانی و اقتصادی حالات نے وضع کیے۔ اس نظریے کا منطقی تعاقب کیا جائے تو اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ انسانی زندگی میں ہر اخلاقی ضابطے سے انکار کر دیا جائے' کیونکہ اگر اخلاقی ضوابط کو ایک قطعی اور مستقل حیثیت نہ دی جائے تو ان کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ مان لیں کہ نیکی اور بدی یا حق اور باطل کے معیار انسان کے ساختہ پرداختہ ہیں اور یہ عمرانی معمولات و ماحول کی بدلتی رہنے والی پیداوار ہیں تو ہم انہیں انسانی معاملات میں قابل اعتماد ہدایت کا وسیلہ قرار نہیں دے سکتے۔ ان معاملات کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں اخلاقی ہدایت سے ہم تدریجاً بے نیاز ہوتے جاتے ہیں اور صرف ہنگامی مصلحت پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ انسانی گروہوں کے اندر اور ان کے درمیان اختلافات بڑھانے کا موجب ہوتا ہے اور انسان کے لیے جو مقدار راحت کی لازم ہے' اس میں رفتہ رفتہ کمی ہوتی جاتی ہے۔ موجودہ دنیا کے اندر جو گہری تشویش و بے اطمینانی آج نمایاں ہے' غالباً اس کی حقیقی توجیہ یہی ہے۔

کوئی قوم یا جماعت اس وقت تک راحت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی' جب تک اس میں حقیقی اتحاد موجود نہ ہو۔ کوئی قوم اس وقت تک حقیقتاً متحد نہیں ہو سکتی' جب تک انسانی معاملات میں نیک و بد کے متعلق اس کے اندر وسیع ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے۔ اس قسم کی ہم آہنگی اس وقت تک ممکن نہیں' جب تک وہ قوم یا جماعت کسی دائمی اور مستقل اخلاقی قانون سے پیدا ہونے والے اخلاقی ضابطے پر متفق نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ صرف مذہب اسی قسم کا قانون مہیا کر سکتا ہے اور یہی قانون کسی گروہ کے اندر اس اخلاقی ضابطے پر اتفاق کی بنیاد بن سکتا ہے' جو گروہ کے تمام افراد پر واجب و لازم ہو۔

مذہب اور اخلاق

کسی مذہب کے خاص احکام کچھ ہوں' اس کی تعلیمات اعلیٰ پیمانے کی ہوں یا دقیانوسی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وضع کی یا وہ توحید کا داعی ہو یا شرک کا' اصنام پرستی اس کا شیوہ ہو یا وہ وحدت وجود پر قائم ہو' تاہم ہر مذہب کی داخلی بنیاد دو اساس ۔۔۔ تاریخ کے ہر دور اور تہذیب کی ہر نمود میں ۔۔۔ اول انسان کا یہ دلی عقیدہ رہا ہے کہ اس دنیا کے تمام وجود اور تمام حوادث و وقائع ایک دانا و بینا اور ہمہ گیر تخلیقی قوت کا نتیجہ ہیں یا سادہ لفظوں میں کہہ لیجئے کہ الٰہی ارادے کے مظہر ہیں۔ دوم یہ احساس کہ ہر فرد کو اس ارادے سے روحانی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ اسی احساس اور اسی عقیدے پر نیک و بد کے فیصلے میں انسانی صلاحیت مبنی رہی اور مبنی ہے۔ جب تک ہم یہ نہ مان لیں کہ ایک مطلق اور منصوبہ بند ارادہ پوری تخلیق کی تہہ میں کارفرما ہے۔ یہ فرض کرنے کے کوئی معنی نہیں کہ ہمارے مقاصد و اعمال اصلاً نیک ہیں یا بد' اخلاقی ہیں یا غیر اخلاقی' ایسے منصوبہ بند ارادے کے عقیدے کے بغیر اخلاق کے متعلق ہمارے تصورات لازماً مبہم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے سامنے مسئلے کی صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ آیا کوئی مقصد یا عمل متعلقہ فرد یا اس قوم کے لیے' جس کا وہ رکن ہے' مفید (اس لفظ کی عملی حیثیت میں) ہے یا نہیں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق و باطل یا نیک و بد صرف اضافی اصطلاحیں رہ جاتی ہیں۔ جو شخص چاہے' ذاتی یا جماعتی ضرورتوں کے مطابق ان کی تعبیر کر لے اور یوں یہ اصطلاحات ہر طبقے کے عمرانی و اقتصادی ماحول میں مسلسل تغیر و تبدل کا محور بن جاتی ہیں۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ عہد حاضر کے رجحانات قطعاً مذہب کے خلاف ہیں تو دائرہء اخلاق میں مذہبی فکر و احساس کے متعلق یہ افکار انتہائی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ارباب فکر و نظر کا کوئی نہ کوئی طبقہ ہمیں ہر روز اور ہر مقام پر بتاتا رہتا ہے کہ مذہب صرف انسانی ماضی کی وحشت و بربریت کی یادگار ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں اور اب اس کی جگہ "سائنس کے دور" نے لے لی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس فرسودہ اور دقیانوسی مذہبی نظاموں کی جگہ لینے والا ہے۔ یہ بڑی جلالت و شان سے بے پناہ طریق پر پیشقدمی کر رہا ہے اور آخر انسان کو "عقل مجرد" کے مطابق رہنا سہنا سکھا دے گا' اور اس قابل بنا دے گا کہ انسان کسی فوق الادراک تصدیق و توثیق کے بغیر اخلاق کے نئے معیار مدون کر لے۔

سائنس کے تعلق میں یہ طبعی و فطری رجائیت حقیقۃً دور حاضر کی پیداوار نہیں' بلکہ یہ پہلے سے چلی آتی ہے۔ مغرب نے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں جس رجائیت پر زور دیا تھا' یہ اسی کی نقل ہے' مگر اس کی جانچ پڑتال پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس دور میں (خصوصاً انیسویں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدی کے نصف آخر میں) مغرب کے بہت سے سائنس دان سمجھ رہے تھے کہ اسرار کائنات کا حل بالکل قریب آ گیا ہے اور آئندہ انسان انتہائی آزادی ومعقولیت سے زندگی کا نقشہ آراستہ کرلے گا۔ کوئی طاقت اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکے گی۔ ہمارے عہد کے مفکرین اس باب میں اگر متشکک نہیں تو کم گو ضرور ہیں۔ دور حاضر یعنی بیسویں صدی کی طبیعیات کے زبردست اثر کے تحت دور حاضر کے ارباب فکر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علت ومعلول کا پابند سائنس وہ روحانی امیدیں پوری نہیں کر سکتا' جو اس کے ساتھ سو، بلکہ پچاس سال پیشتر وابستہ کی گئی تھیں' کیونکہ جیسے جیسے کشف وتحقیق کا قدم آگے بڑھا' کائنات کے اسرار زیادہ سے زیادہ پراسرار وپیچیدہ ہوتے گئے۔ یہ حقیقت واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ ممکن ہے' خالص سائنٹفک ذرائع سے مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب مل ہی نہ سکے۔

۱۔ یہ کائنات کیونکر وجود میں آئی؟

۲۔ اس پر زندگی کا ظہور کیونکر ہوا؟

۳۔ جس شے کو ہم زندگی سے تعبیر کرتے ہیں' وہ کن اجزاء سے مرکب ہے؟

۴۔ انسانی بقا کی حقیقی نوعیت اور مقصد کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ جب تک آخری سوال کا جواب نہ مل جائے' ہم نیک وبد یا حق وباطل یا خیر وشر کی اخلاقی قدر وقیمت معین کرنے کے لیے قدم ہی نہیں اٹھا سکتے' کیونکہ جب تک ہمیں انسانی بقا کی نوعیت ومقصد کے متعلق علم (حقیقی یا قیاسی) نہ ہو جائے' نیک وبد' حق وباطل اور خیر وشر کے کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔

ہمارے انتہائی ترقی یافتہ سائنس دان اب اس حقیقت کا احساس کرنے لگے ہیں۔ وہ طبعیات میں کشف وتحقیق کی بنا پر فوق الطبیعیات مسائل کا کوئی جواب مہیا نہیں کر سکے' لہٰذا انہوں نے گذشتہ دو سو سال کی یہ امید ہی ترک کر دی ہے کہ سائنس اخلاق وآداب کے دائرے میں ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے یا کبھی بنے گا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اعلیٰ درجے کے سائنسدان سائنس پر اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ حاشا وکلا۔ اس کے برعکس ان کا عقیدہ ہے کہ سائنس عالم انسانیت کو علم وعمل کے بدرجہا عجائب خیز کارناموں تک پہنچائے گا' مگر ساتھ ہی انہیں احساس ہو چکا ہے کہ سائنٹفک سعی وکوشش کو انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ بے شک سائنس ہمارے لیے اپنے اندر اور گردوپیش کی دنیا کے متعلق فہم و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بصیرت کے بہتر مواقع مہیا کر سکتا ہے اور کر رہا ہے' لیکن اس کا تعلق صرف حقائق فطرت کے مشاہدے سے ہے اور وہ ان قوانین کا تجزیہ کرتا ہے' جو ان حقائق کے باہمی تعلق پر حاوی ہیں' لہٰذا سائنس سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ انسانی زندگی کے مقصد و نصب العین پر فتوے صادر کرے گا اور یوں ہمارے لیے عمرانی روش کے سلسلے میں ایسے محکم ہدایت نامے مہیا ہو سکیں گے' جنہیں اختیار کر لینا چاہیے۔ جو حقائق مسلم ہیں' ان کی بنا پر محض قیاسی استدلال کے ذریعے سے بالواسطہ سائنس ہمیں مشورہ دینے کی کوشش کر سکتا ہے' مگر وہ برابر تغیر پزیری کی حالت میں ہے۔ فطرت کے متعلق نئے نئے حقائق دریافت ہوتے رہتے ہیں اور جو فیصلے سابقہ دریافت شدہ حقائق کی بنا پر کیے گئے تھے' ان کی تعبیر و جائزہ میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے' لہٰذا سائنس کا مشورہ متذبذب' غیر مسلسل اور بعض اوقات سابقہ مشورے کی بالکل ضد ہو گا۔ گویا خلاصۃً کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کسی بھی دور میں یقین و وثوق کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ بہبود و راحت کے حصول کی غرض سے انسان کو کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ بنا بریں سائنس انسان میں اخلاقی شعور کی تربیت نہیں کر سکتا (نہ کبھی اس نے ایسی کوشش کی ہے)۔ غرض اخلاق و آداب کے مسائل سائنس کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کا تعلق کاملاً مذہب کے دائرے سے ہے۔

صرف مذہب ہی کے ذریعے سے ہم اخلاقی جائزے کے ان معیاروں پر پہنچ سکتے ہیں ـــــ صحیح یا غلط ـــــ جو ہمارے ماحول کے وقتی تغیرات سے بالا ہوں۔ میں نے کہا: ''صحیح یا غلط'' کیونکہ استدلال کے معروضی و خارجی اصول کے مطابق مذہب میں فوق الطبیعیت مقدمات کے متعلق غلط فہمی کا امکان ہے۔ اس وجہ سے ان اخلاقی جائزوں میں بھی غلطی کا امکان ہے' جو ان مقدمات پر مبنی ہوں۔ غرض کسی مذہب کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ ہمارے عقل و استدلال کی بنا پر ہونا چاہیے اور ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا مذہب انسان کی تمام مادی و روحانی ضرورتوں کا کفیل بن سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ کسی مذہب کی تعلیمات کے متعلق اپنی انتقادی صلاحیتوں سے کام لینے کی ضرورت اس بنیادی معاملے پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ صرف مذہب ہماری زندگی میں معنی پیدا کر سکتا ہے اور ہماری فکر و روش میں ان اخلاقی اقدار سے مطابقت کو تقویت پہنچا سکتا ہے' جو ہماری انفرادی بقا کی عارضی تابانی سے کاملاً بالا ہو۔ دوسرے لفظوں میں صرف مذہب ہی انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کے وسیع مواقع مہیا کر سکتا ہے اور وہ جان سکتے ہیں کہ نیکی اور خیر کیا ہے (لہٰذا وہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطلوب ہے) نیز بدی اور شر کسے کہتے ہیں (لہٰذا اس سے دور رہنا چاہیے) اور کیا اس باب میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کا اتحاد و اتفاق انسانی روابط میں کسی نوع کا نظم پیدا کرنے کے لیے ایک قطعی اور ناگزیر شرط ہے؟

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان میں مذہبی جذب وطلب اس کے روحانی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا محض عارضی پہلو نہیں' بلکہ اس کے اخلاقی فکر اور تصورات و آداب کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ وہ ہماری قدیم خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں' جس کی ضرورت ایک متنور دور کو نہیں رہتی' بلکہ ہر دور اور ماحول میں انسان کی حقیقی اور بنیادی ضرورتوں کا وہ واحد کفیل ہے۔ اسے وجدان کہنا چاہیے۔

یہ سمجھ لینا عین قرین دانش وفکر ہے کہ جو مملکت مذہب کی بنیادوں پر تعمیر کی جائے گی' اس میں قومی راحت کے حد درجہ بہتر ممکنات مہیا ہوں گے اور جو مملکت سیکولر سیاسی تصور کی بنا پر قائم ہوگی' اس میں ویسے ممکنات مہیا نہیں ہوسکتے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جس مذہبی نظریے پر مملکت کا انحصار ہے ۔۔۔ جس سے یہ اختیار حاصل کرتی ہے ۔۔۔ اس میں اولاً انسان کی حیاتیاتی اور عمرانی ضرورتوں کے لیے پورے انتظامات کیے جائیں۔ ثانیاً اس تاریخی اور فکری ارتقاء کا قانون پیش نظر رکھا جائے' جو ہر انسانی معاشرے پر حاوی ہے۔ ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط یوں پوری ہوسکتی ہے کہ زیر غور مذہبی نظریے میں انسان کی صرف روحانی فطرت ہی کی نہیں' بلکہ حیاتیاتی فطرت کی مثبت قدر و قیمت بھی پیش نظر رکھی جائے۔ اسلام کا خاصہ لاریب یہی ہے۔ دوسری شرط کے پورا کرنے کی صورت یہ ہے کہ سیاسی قانون' جو قوم کی روش کا رہنما ہوگا' محض مثبت اور بدیہی ہی نہ ہو' بلکہ سختی اور صلابت سے بھی آزاد ہو' یعنی لچکیلا ہو۔ قرآن و سنت نے جو سیاسی قانون پیش کیا ہے' اس میں یہ دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں۔

میں آئندہ صفحات میں اس دعوے کے اثبات کی کوشش کروں گا' لیکن یہ کام شروع کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اسلامی قانون کے تصور سے متعلق چند عام گزارشیں پیش کر دوں' کیونکہ مسلم اہل علم وفضل کے درمیان شرعی قانون سازی کے حدود و تفصیلات کے سلسلے میں اتفاق رائے موجود نہیں۔

اسلامی قانون کی وسعت

معلوم ہے کہ اسلامی فقہ کا موضوع جو قوانین ہیں' وہ سب کے سب ان ہدایات و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امتناعات (اوامر ونواہی) پر مبنی نہیں' جن کے بارے میں قرآن وسنت نے واضح الفاظ میں فیصلہ کر دیا۔ فقہی فیصلوں کا بڑا حصہ مختلف استنباطی استدلال کا نتیجہ ہے۔ ان میں قیاس کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے۔ دور ماضی کے بڑے بڑے فقیہ قرآن وسنت کے مطالعے کی بنا پر قانونی نکتے دریافت کر سکے اور بلاشبہ فقہ کے ممتاز ترین شارحین کا یہ مطالعہ حددرجہ گہرا اور پرخلوص تھا۔ تاہم مطالعے کے نتائج اکثر بڑی حد تک داخلی وموضوعی تھے' یعنی اسلام کے شرعی مآخذ سے متعلق مختلف ائمہ وفضلاء نے اپنی تعبیرات اور نقطہء نگاہ پیش نظر رکھا' ساتھ ہی ان کے عہد کا عمرانی وفکری ماحول ان کے سامنے رہا۔ چونکہ وہ ماحول مختلف اعتبارات سے ہمارے ماحول کے مقابلے میں بڑی حد تک مختلف تھا' لہٰذا ہم ان مآخذ سے استنباط نتائج کریں تو یہ استنباط ان ائمہ کے نتائج سے طبعاً مختلف ہوگا۔ دور حاضر کے مسلمان رسمی فقہ کے احکام ونتائج سے معاصر سیاسی واقتصادی معاملات میں کام لینے کے متعلق جس تامل وتوقف کا اظہار کر رہے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

یہ فیصلے صادر کرنے والوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خاص مسائل کے متعلق شرعی اصول کے اطلاق میں سہولت رہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' ان مسائل کے متعلق عوام کے دل میں ایک خاص قسم کا احترام پیدا ہوتا رہا۔ اب بہت سے مسلمان ان فیصلوں کو شریعت یعنی مذہبی قانون کا لاینفک جزو سمجھتے ہیں۔ اس عامی نظریے کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید یا صحیح احادیث میں اوامر ونواہی کے متعلق واضح بیانات کا ذخیرہ اتنا نہیں' جو ممکن قانونی ضروریات کے لیے کافی سمجھا جائے' لہٰذا قانونی مجموعے کی توسیع استنباط کے ذریعے سے ضروری ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ ظاہر ہے کہ قرآن یا سنت سے شریعت کی ایسی من مانی توسیع کے لیے کوئی خفیف سی شہادت بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ کہنا بھی بجا ہوگا (اور مسلمان فضلاء کی خاصی بڑی تعداد برابر یہ کہتی رہی) کہ قرآن وسنت کے واضح احکام کا دائرہ اتفاقی اغماض کی بنا پر محدود نہیں رہا' بلکہ عمداً اس اہم مصلحت کی بنا پر محدود رکھا گیا کہ قانونی وعمرانی لوچ اور لچک پر کوئی اثر نہ پڑے۔ غرض یہ سمجھ لینا بالکل معقول ہے کہ شریعت میں تمام ضروریات زندگی کی تفصیلات دانستہ بیان نہیں کی گئیں۔ گویا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ چند قانونی حدیں مقرر کر دی جائیں' جن کے اندر رہ کر امت خودبخود نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرے اور جتنے بھی بے شمار قانونی مواقع پیش آسکیں' ان کا فیصلہ مسئلہ بہ مسئلہ وقت اور بدلتے ہوئے عمرانی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات کے تقاضوں کی بنا پر کیا جائے۔

اصل شریعت فقہ کے اس قانونی نظام کے مقابلے میں بہت موجز و بلیغ اور مختصر ہے' جو اسلامی فکر کے مختلف دبستانوں نے تیار کر دیا۔ شریعت الٰہی قانون کا مجموعہ ہے' جو داخلی و موضوعی وضع کے فاضلانہ استنباطات یا نتائج پر منحصر نہیں ہو سکتی' بلکہ اسے کاملاً قرآن و سنت کے قطعی احکام کی شکل میں دیکھنا چاہیے' یعنی وہ احکام جن کے متعلق مثبت قانونی وضع میں بتا دیا گیا' "یہ کرو اور یہ نہ کرو" "یہ چیزیں خیر ہیں' اس لیے مطلوب ہیں" "یہ چیزیں شر ہیں' اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔" ان احکام کو اصطلاحاً "نصوص" کہتے ہیں۔ ان کی مختلف تعبیرات کی ہی نہیں جا سکتیں' بلکہ ان میں تعبیر کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنی جگہ مکمل اور الفاظ میں غیر مبہم ہیں۔ تمام عرب ماہر لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ نصوص' قرآن و سنت کے ان احکام کو کہتے ہیں' جو ظاہر الفاظ میں بدیہی ہوں [1]۔ تمام نصوص ایسی شکل میں پیش کیے گئے ہیں کہ انسان کے عمرانی وفکری نشو ارتقاء کے ہر مرحلے پر ان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس فقہاء کے بہت سے داخلی و موضوعی نتائج ایک خاص وقت اور ذہنیت کے افکار ہیں لہٰذا ان کی دائمی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ گویا نصوص قرآن و سنت ـــ اور صرف وہی ـــ بہ حیثیت مجموعی حقیقی اور دوامی شریعت اسلام ہیں۔ یہ شریعت صرف ان احکام پر مبنی ہے' جن میں کسی واجب کا فیصلہ غیر مشتبہ الفاظ میں کر دیا گیا ہے یا اسے ناجائز قرار دے دیا گیا ہے لیکن جن چیزوں اور سرگرمیوں کے وسیع تر دائرے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا ـــ نہ از روئے نص ان کے کرنے کا حکم دیا گیا اور نہ ان کی ممانعت کی گئی ـــ ان سب کو شرعی نقطۂ نگاہ سے مباح سمجھنا چاہیے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ جو نظریہ اوپر پیش کیا گیا ہے' وہ اسلامی فکر میں کوئی نئی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا نقطۂ نگاہ یہی تھا اور آگے چل کر اسلام کے بعض بہت بڑے علماء کا نقطۂ نگاہ یہی رہا' خصوصاً اس شخص کا نقطۂ نگاہ' جسے بجا طور پر اسلام کے ممتاز ترین فقہا میں شمار کیا جاتا ہے' یعنی ابن حزم قرطبی (۹۹۴ ع تا ۱۰۶۴ ع) زیر غور مسئلے کے متعلق اس سے زیادہ توضیحی بیان کوئی نہیں ہو سکتا' جو ابن حزم کی عظیم القدر تصنیف "المحلیٰ" کے مقدمے

۱۔ لسان العرب مطبوعہ بیروت ۱۹۵۷ع (۱۳۷۵ھ) جلد نمبر ۷ ص ۹۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں درج ہے۔

''شریعت پوری کی پوری یا تو فرض ہے' جس کا ترک موجب معصیت ہے یا حرام ہے' جس کا ارتکاب گناہ ہے یا مباح ہے جس پر نہ عمل گناہ ہے' نہ اس کا ترک گناہ ہے۔ مباح کی تین قسمیں ہیں' اول وہ افعال' جنہیں مستحب قرار دیا گیا (مندوب)۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کرنا باعث اجر ہے' نہ کرنا گناہ نہیں۔ دوم وہ افعال جنہیں مکروہ قرار دیا گیا۔ ان کا ترک باعث اجر ہے اور جو کرے' وہ گنہگار نہیں۔ سوم مطلق مندوب' یعنی نہ کرنے پر اجر ہے' نہ ترک پر گناہ ہے۔ اسی طرح نہ ان کا کرنا موجب گناہ ہے' نہ ترک۔۔۔۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جن امور کے متعلق میں نے کچھ نہیں کہا' ان کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کرو۔ دیکھو' تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں' وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء سے بہت سوال کیے۔ پھر انبیاء سے متعلق ان میں اختلاف پیدا ہوا (ان کی تعلیمات کے متعلق) پس اگر میں کسی چیز کے لیے کرنے کا حکم دوں تو اس حد تک کرو' جس حد تک تم میں استطاعت ہو۔ اگر میں کسی چیز سے روک دوں تو اس سے باز رہو۔''

''اس حدیث میں دین کے تمام اصول اول سے آخر تک جمع ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جن امور کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔۔۔ نہ کرنے کا حکم دیا' نہ منع کیا۔۔۔ وہ مباح ہیں' یعنی نہ مسنون ہیں' نہ واجب۔ جن امور کا حکم دے دیا' وہ فرض ہیں اور جن امور سے منع کر دیا' وہ حرام ہیں۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام صادر فرما دیے' ان پر ہمارے لیے استطاعت کی حد تک عمل واجب ہے[1]۔''

چونکہ حقیقی شریعت اوامر و نواہی تک محدود ہے' جو قرآن و سنت میں واضح طریق پر بیان کر دیے گئے' اس لیے شریعت حد درجہ مختصر اور بلیغ ہے اور اسے سمجھ لینا بہت سہل ہے۔ یہ ایک

۱۔ صحیح مسلم بہ روایت ابو ہریرہؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوٹی سی جلد میں سما سکتی ہے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' اس میں زندگی کی ہر ضرورت کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام نہیں کیا گیا' نہ کیا جا سکتا تھا' یعنی ہم مسلمانوں کے متعلق قانون دینے والے کا منشا یہ تھا کہ مزید ضروری قانون سازی کا انتظام اجتہاد سے کریں اور وہ روح اسلام کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن وسنت کی بناء پر ہم جو اجتہادی قانون سازی کریں گے (وقتاً فوقتاً گزشتہ دوروں کے اجتہاد سے بھی مدد لیں گے) اس قانون سازی میں آئندہ نسلوں کے اجتہاد سے برابر ترمیم ہو سکے گی' یعنی ہماری قانون سازی ہنگامی ہوگی اور یہ قانون ناقابل تردید وتنسیخ شریعت کے تابع بدلتا رہے گا۔ یہ شریعت نصوص قرآن وسنت کے سوا کچھ نہیں۔

شریعت میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا' کیونکہ وہ الٰہی قانون ہے۔ اس میں ردوبدل کی ضرورت بھی نہیں' کیونکہ اس کے احکام اس طریق پر بنائے گئے ہیں کہ کوئی بھی حکم انسان کی فطرت صحیحہ اور انسانی معاشرے کے حقیقی تقاضوں سے کسی بھی زمانے میں متصادم نہیں ہو سکتا۔ اس کی صاف اور سادہ وجہ یہ ہے کہ ان احکام میں انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو نظر وضبط کے تابع لایا گیا ہے' جن میں فطرۃً تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ الٰہی قانون کا یہ خاص پہلو ـــ انسانی ارتقاء کے تمام احوال ومراحل پر اس کا اطلاق ـــ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کے احکام اولاً عام اصول پر حاوی ہوں (تفصیلات میں ہنگامی ضرورت کے وقت تبدیلی کی اجازت ہے)۔ ثانیاً ان میں ایسے معاملات کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام کر دیا گیا ہو' جن میں انسان کے عمرانی ارتقاء سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ نصوص کے متن کا جائزہ لیا جائے تو یہ گزارش بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔ جب کسی نص میں کوئی تفصیلی قانون موجود ہے تو وہ ایسی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق ہوگا' جسے ہنگامی تغیرات سے بالا سمجھنا چاہیے (مثلاً انسانی فطرت اور انسانی روابط کے بنیادی عناصر) اس کے برعکس جب انسانی ترقی کے لیے کوئی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے (مثلاً نظام حکومت' فنکاری' اقتصادی قانون سازی وغیرہ) تو شریعت مفصل قوانین بناتی ہی نہیں۔ ایسے امور میں یا تو صرف عام اصول بیان کر دینے پر اکتفا کرتی ہے یا قانون سازی سے بالکل اعراض کر لیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے' جہاں اجتہاد کی بناء پر قانون سازی بجا

۱۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ جلد اول صفحہ ۶۲۔۶۴۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھی جا سکتی ہے۔ اس معاملے کو زیادہ معین شکل میں پیش کرتے ہوئے ہم کہ سکتے ہیں کہ اجتماعی قانون سازی کا جائز دائرہ مندرجہ ذیل پر مشتمل ہے:

الف۔ ان معاملات ومواقع کے متعلق تفصیلات کا انتظام جن میں شریعت نے صرف عام اصول پیش کر دیے اور مفصل احکام نہیں دیے۔

ب۔ ان معاملات کے متعلق اصول وتفصیلات کا انتظام جو مباح ہیں' یعنی شرعی قانون ان پر حاوی نہیں۔

یہی قاعدہ ہے' جس کا ذکر قرآن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا. (۱)

ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور ایک راہ۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

غرض الٰہی قانون (شریعت) نے اسلامی زندگی کے لیے وہ دائرہ کھینچ دیا ہے' جس میں نشو وارتقاء کی اجازت ہے۔ سرچشمہ قانون نے اس دائرے میں ہمیں کھلا راستہ (منہاج) دے دیا ہے تاکہ دنیوی زندگی کے لیے قانون بنالیں' جو ان ضرورتوں کو پورا کر سکے' جنہیں نصوص قرآن وسنت نے دانستہ چھوڑ دیا۔ (۲)

۱۔ سورہ مائدہ آیت ۴۸۔

۲۔ یہاں یہ توضیح کر دینی چاہیے کہ ایک چیز دین ہے اور ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین اصل ہے وہ خدا پرستی اور نیک عملی کا قانون ہے۔ شرع اور منہاج دستور العمل اور طور طریقہ ہے جو اصل کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ٹھہرایا جاتا ہے۔ دین ایک ہی ہے اور تمام پیغمبروں نے اسی کی تعلیم دی لیکن شرع ومنہاج میں اختلاف ہوا' کیونکہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال وظروف یکساں نہ تھے (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۱) خدا نے ہر امت کا آئین اور طریق کار اس کے احوال واستعداد کے مناسب جداگانہ رکھا ہے اور باوجودیکہ تمام انبیاء اور ملل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں' جن پر نجات ابدی کا مدار ہے' باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں' پھر بھی جزئیات وفروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص خاص احکام وہدایات دی گئیں۔ اس آیت میں اسی فرعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے (حواشی قرآن از شیخ الہند صفحہ ۱۵۰) مطلب یہ ہے کہ مستند علماء کے نزدیک یہاں تقسیم شریعت اور منہاج کی نہیں' بلکہ دین اور شرع ومنہاج کی ہے۔ دین سب کا ایک ہے' شرع ومنہاج کا اختلاف وقتی حالات کی بنا پر ہوا' پھر آخر میں اسلام نے شرع ومنہاج کا معاملہ بھی ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔ قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جو قومیں کسی الہامی کتاب کو مانتی ہیں' ان کے شرائع میں جزوی اختلاف اصل دین پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ سورہ مائدہ کے جس مقام پر یہ ٹکڑا آیا ہے' اس کا سیاق اسی مفہوم کا مؤید ہے۔ مفسرین سے شرع اور منہاج کے مفہوم کے متعلق مختلف قول منقول ہیں۔ میں نے تفصیل ضروری نہیں سمجھی۔ (مترجم)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد تحقیقات کی ضرورت

اسلام کے کھلے راستے (منہاج) کی از سر نو دریافت ایسے موقع پر حد درجہ ضروری ہے' جب دنیائے اسلام ثقافتی بحران میں مبتلا ہے اور ایک عملی قضیے کی شکل میں اسلام کی صداقت کا فیصلہ نفیاً یا اثباتاً صدیوں کے لیے ہو جائے گا۔ ہم تیزی سے بدلنے والی دنیا کے اندر بیٹھے ہیں۔ ہمارا معاشرہ بھی اسی بے پناہ قانون تغیر کا تختہء مشق ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں' تغیر ناگزیر ہے' بلکہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت جتنی بدیہی ہے' اتنی ہی بے پناہ ممکنات سے لبریز ہے' خواہ وہ بہتر ہوں یا بدتر۔ ''بہتر ہوں یا بدتر'' کا جملہ خاص توجہ کا محتاج ہے اور ہمیں بھولنا نہ چاہیے کہ ''تغیر'' ''حرکت'' کا دوسرا نام ہے اور ایک عمرانی نظام میں ''حرکت'' تخلیقی حیثیت بھی اختیار کر سکتی ہے اور تخریبی بھی ہو سکتی ہے۔ اسلامی نقطہء نگاہ سے قرآن وسنت کے حقائق کی طرف عود اور اپنے سیاسی فکر نیز عمرانی سرگرمیوں کے لیے وسائل کے مبانی کی تلاش پہلی قسم کی ''حرکت'' ہو گی (یعنی تخلیقی) لیکن اگر اسلامی معاشرہ موجودہ حالت کی طرح مغربی تصورات و ادارات کی طرف منتقل ہوتا گیا تو یہ ''حرکت'' دوسری قسم کی ہو گی (یعنی تخریبی) ہمیں سازگار معلوم ہو تو مغربی تصورات و ادارات کی جانب پیش قدمی کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہی ہو گا کہ اسلام تہذیب کے ایک مستقل عامل کی حیثیت میں رفتہ رفتہ محو ہوتا جائے گا۔ اگر ہم چاہیں تو اسلام کا عمرانی وسیاسی لائحہ عمل از سر نو تیار کر سکتے ہیں اور اس طرح اپنی ثقافت میں۔۔۔۔ جو اب انحطاط کی افسردہ راکھ پر افتادہ ہے۔۔۔۔ زندگی کی نئی روح پھونک سکتے ہیں۔

اگر ہم دوسری راہ عمل کا فیصلہ کریں تو محض یہ کہہ دینا کافی نہ ہو گا کہ ''ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اپنے نظریات ہیں۔'' ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے' جس سے ہم اپنے آپ پر اور ساری دنیا پر آشکارا کر سکیں کہ ہمارے نظریات میں زندگی کی اتنی قوت ہے' جو ہر طرف سے آنے والے متعدد مخالف عمرانی وثقافتی اثرات کا مقابلہ کر سکے اور ان نظریات میں آج بھی ہمیں اپنا مستقل سیاسی نظام بنا لینے کی روشن ہدایتیں موجود ہیں۔ اس کارنامے کو پورا کرنے کے قابل ہم اس وقت ہو سکتے ہیں' جب اسلام کے ان عمرانی وسیاسی قوانین پر بے نتیجہ اعتماد سے کنارہ کش ہو جائیں' جو سابقہ ادوار کے مسلم علماء کو آخری وقطعی معلوم ہوتے رہے۔ پھر ہمیں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

از سرِ نو تحقیقی طریق پر غور و فکر شروع کر دینا چاہیے' جو اسلام کے اصل مآخذ کے مطالعے پر مبنی ہو۔ اگر ہم اس آزادانہ تحقیق و تفتیش کے جذبے کے پیش نظر کام کی ابتدا کریں گے تو دو اہم نتیجوں پر پہنچیں گے' اول اسلامی قانون کا تصور۔۔۔ خصوصاً عام قانون کے متعلق ۔۔۔ پھر وہی سادگی اختیار کر لے گا' جو سرچشمہ نے اسے دی تھی' لیکن آگے چل کر یہ بہت سی رسمی اور اکثر من مانی تعبیرات کی تہوں کے نیچے دفن ہوتا رہا۔ دوم ۔۔۔ اور یہ پیش نظر مسئلے کے لیے حد درجہ موزوں ہے ۔۔۔ اسلامی مملکت کے ظاہری اشکال و وظائف کے لیے ضروری نہیں کہ وہ لازماً کسی تاریخی نمونے کے مطابق ہوں۔ کسی مملکت کے لیے اسلامی کہلانے کا استحقاق حاصل کرنے کی غرض سے صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے دستور اور کاروبار میں اسلام کے وہ غیر مشتبہ قوانین واضح طور پر شامل ہو جائیں' جنہیں امت کی عمرانی' سیاسی اور اقتصادی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ یہ احکام بہت کم ہیں اور بڑی وضاحت سے پیش کر دیے گئے ہیں' نیز وہ سب کے سب اس نوعیت کے ہیں کہ ہمیں خاص اوقات اور خاص عمرانی حالات میں ضروریات کے مطابق زیادہ سے زیادہ آزادی و کشادگی حاصل رہتی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا باب:

مصطلحات اور تاریخی نمونہ

مغربی مصطلحات کا غلط استعمال

اسلامی مملکت کے متعلق فکری ابتری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ۔۔۔ اسلامی نظریے کے حامی اور اس کے معترض' دونوں ۔۔۔ بلا امتیاز مغربی سیاسی مصطلحات وتعریفات اسلام نظام سیاست کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں' حالانکہ اس نظام کا بنیادی تصور سراسر مختلف ہے۔ دور حاضر کے مسلمانوں کی تصانیف میں بار بار اس قسم کے دعوے پائے جاتے ہیں کہ ''اسلامی'' کا مطب ''جمہوری'' ہے اور اسلام کا نصب العین ایک ''اشتراکی'' معاشرے کا قیام ہے۔ بہت سے مغربی ارباب قلم اسلام میں نام نہاد ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ سیاسی تعریفات کی ایسی سطحی کوششیں محض متضاد ہی نہیں (اس وجہ سے سنجیدہ غور و بحث کے لیے ان کی کوئی عملی قدر و قیمت نہیں) بلکہ ان میں ایک خطرہ بھی شامل ہے' یعنی اسلامی معاشرے کے مسائل کو صرف مغربی تاریخی تجربات کے زاویے سے دیکھا جائے اور درست یا قابل اعتراض معاملات کو صرف ناظر کے مشاہدے پر موقوف رکھا جائے۔ یہ طریقہ اسلام کے عالمی نظریے کے اعتبار سے سراسر خارج از بحث ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی یورپی یا امریکی فرد ''جمہوریت'' ''آزاد خیالی'' ''اشتراکیت'' ''حکومت'' ''الہیہ'' ''پارلیمانی نظام'' وغیرہ کی مصطلحات استعمال کرتا ہے تو وہ ان تمام چیزوں کو مغربی تاریخی تجربے کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ مصطلحات نہ صرف بجا ہیں' بلکہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہیں' کیونکہ دماغ میں فی الفور ایسی تصویریں اجاگر ہو جاتی ہیں' جو پیش آمدہ حالات کا صحیح نقشہ ہیں اور مغرب کے تاریخی نشو و ارتقاء میں ایسے حالات پھر بھی پیش آسکتے ہیں۔ یہ تصویریں ان تغیرات میں بھی محفوظ رہ سکتی ہیں' جو مرور زمانہ سے تمام انسانی تصورات پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ مزید برآں ذہنی تغیر کی حقیقت ۔۔۔ یہ حقیقت کہ جو سیاسی مصطلحات آج رائج ہیں' ان کے معنی ابتدائی معانی سے مختلف ہیں ۔۔۔ ہر لحظہ مغربی مفکر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سامنے رہتی ہے۔ اس وجہ سے مغربی مفکر میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنے سیاسی مصطلحات کو برابر نظر ثانی اور تطابق نو کے اعتبار سے دیکھ سکے۔ جونہی ان ترشے ترشائے سیاسی تصورات کو لوگ ایک کاملاً جداگانہ تہذیب کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں۔ جو سراسر مختلف تاریخی تجربات سے گزری تو فکر کی لچک غائب ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک زیر غور سیاسی اصطلاح یا ادارہ ایک اور مطلق اور غیر متبدل معنی کا حامل بن جاتا ہے' حالانکہ اس سلسلے میں اس کے تاریخی ارتقاء کی حیثیت پیش نظر نہیں رکھی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیاسی فکر میں وہ صلابت پیدا ہو جاتی ہے' جو نئے تصور سے محو کرنی منظور تھی۔

مثلاً ''جمہوریت'' کی اصطلاح لیجئے۔ مغرب میں یہ اصطلاح آج بھی بڑی حد تک ـــ نہ کہ کلیتہ ـــ انہیں معنی میں استعمال کی جاتی ہے' جو انقلاب فرانس میں اسے دیے گئے تھے' یعنی تمام شہریوں کی عمرانی و اقتصادی مساوات کا اصول اور ایک فرد ایک ووٹ کی بنا پر پوری بالغ آبادی کے منتخب نمائندوں کے ذریعے سے حکومت کا انتظام۔ اس اصطلاح کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ عوام کو تمام عوامی معاملات میں اکثریت کے ذریعے سے قانون سازی کا لامحدود حق حاصل ہے۔ یوں عوام کی رضامندی جاری ہو جاتی ہے' کم از کم نظری اعتبار سے اور اس حالت میں جاری ہو جاتی ہے' گویا یہ تمام بیرونی پابندیوں سے آزاد ہے' بجائے خود فائق و برتر ہے اور صرف اپنے روبرو جوابدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ''جمہوریت'' کا یہ تصور ان لوگوں کے تصور سے بہت مختلف ہے' جن سے اس اصطلاح کی ابتدا ہوئی' یعنی قدیم یونانی۔ یونانیوں کے نزدیک عوام کی حکومت یا عوام کے ہاتھوں حکومت سے (جو لفظ ''جمہوریت'' کا صحیح مفہوم ہے) ایک خاص قسم کی حکومت عدیدہ مراد تھی۔ ان کی شہری ریاستوں میں ''عوام'' اور ''شہری'' ـــ یعنی مملکت کے آزاد باشندے ـــ مترادف تھے' حالانکہ شہری یا آزاد باشندے پوری آبادی کے $\frac{1}{10}$ حصے سے نہیں بڑھتے تھے۔ باقی سب لوگ یا تو غلام تھے یا زراعت میں بیگاری تھے۔ وہ صرف معمولی مزدوروں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ انہیں عموماً فوجی خدمت انجام دینے پر مجبور کر دیا جاتا تھا' مگر انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ تھا۔ صرف آبادی کی ایک مہین سی بالائی تہہ ـــ شہری ـــ رائے دہی کا حق استعمال کر سکتی تھی' یعنی تمام سیاسی اختیارات شہریوں کے ہاتھوں میں تھے۔ اس تاریخی آئینے میں دیکھا جائے تو دور حاضر کے مغرب نے ''جمہوریت'' کا جو تصور قائم کیا' وہ قدیم یونانیوں کے تصور آزادی کے مقابلے میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی تصور سے حد درجہ قریب تر ہے' کیونکہ اسلام کے نزدیک تمام انسان عمرانی اعتبار سے برابر ہیں اوران سب کونشوو ارتقاء اور خود نمائی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس اسلام نے مسلمانوں پر لازم قرار دے دیا ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں کو اس الٰہی قانون کی رہنمائی کے تابع رکھیں' جو قرآن لے کر آیا اور جس پر عمل کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے پیش کیا۔ اس وجہ سے امت کے حق قانون سازی پر قطعی پابندیاں عائد ہوگئیں اور ارادہ عوام کو وہ برتری حاصل نہ رہی' جو مغرب کے تصور جمہوریت کا لاینفک جزو ہے جو ''نظریاتی'' جمہوریت روس اور دوسری کمیونسٹ مملکتوں میں رائج ہے' وہ بہ لحاظ تصور اسلامی تصور سے بہ ظاہر مشابہ ہے۔ ان مملکتوں میں بھی اسلام کی طرح نظریے کو عوام کی آزاد قانون سازی سے بالا و برتر رکھا گیا ہے۔ اکثریت کی رائے صرف اس نظریے کے تابع رہ کر موثر ہوسکتی ہے' تاہم جیسا کہ ابھی بتایا گیا' یہ مشابہت محض سرسری اور سطحی ہے۔ اولاً اس لیے کہ اسلام کے تمام نظریات تصورات الٰہی قانون پر مبنی ہیں' جو مومن کے نزدیک اخلاقاً واجب ہے اور اس میں مطلق تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس کمیونزم کے تصورات مسلمہ طور پر انسانی اصول کی پیداوار ہیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ دوررس ترمیمات ہوسکتی ہیں۔ ثانیاً اسلام اس الٰہی قانون کے تصور وتعبیر کو فرد کے علم وضمیر پر موقوف رکھتا ہے اور اسے مجبور نہیں کرتا کہ وہ دوسرے افراد یا منظم جماعت کی تعبیرات اپنے اوپر اخلاقاً واجب جانے (حقیقت یہی ہے کہ اس باب میں اسلامی تعلیمات غیر مشتبہ ہیں' اگرچہ اسلامی تاریخ میں اس اصول کی اکثر خلاف ورزی ہوتی رہی)

جو کچھ بیان کیا جاچکا ہے' اس سے واضح ہے کہ مغرب میں بھی جمہوریت اور جمہوری حقوق کی اصطلاحات حد درجہ وسیع معنی میں استعمال کی جاسکتی ہیں اور کی جارہی ہیں۔ نیز اثباتاً یا نفیاً اسلام کے سیاسی نظریے پر ان کا اطلاق لازماً ابہام کی ایک فضا پیدا کردیتا ہے' ساتھ ہی لفظی شعبدہ بازی کا رجحان سامنے آجاتا ہے۔

بہت سی دوسری عمرانی وسیاسی اصطلاحات کے باب میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے' جو مغربی فکر میں واقعی ایک حقیقی یعنی تاریخی اعتبار سے ثابت شدہ کردار ادا کرچکی ہیں' لیکن اسلامی نظریے کے تعلق میں ان کی حیثیت حد درجہ مشتبہ ہے۔ مثلاً دعویٰ کیا جاسکتا ہے' (جیسا کہ دور حاضر کے بعض مصنفوں نے کیا) کہ اسلام کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہے' کیونکہ اس کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نصب العین ایسی صورت حال ہے' جس میں تمام شہری مساوی موقع' اقتصادی تحفظ اور قومی دولت کی منصفانہ تقسیم سے یقینی طور پر مستفید ہوں۔ تاہم اسی درجہء یقین کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس سے مقصود پوری عمرانی زندگی کی بے لوچ گروہ بندی ہے (جیسا کہ مارکسی اشتراکیت میں بے شک وشبہ کیا گیا ہے) تو اسلام اشتراکیت کا مخالف ہے۔ اس طرح اقتصادیات کو اخلاق پر برتری مل جاتی ہے اور فرد کا درجہ محض ایک اقتصادی عامل کا رہ جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی محض سادہ اثبات یا نفی میں نہیں دیا جاسکتا کہ آیا اسلام کا مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے؟ اگر حکومت الٰہیہ سے مراد ایسا عمرانی نظام ہے' جس میں تمام قوانین اس سرچشمے سے نکلیں' جسے قوم الٰہی قانون مانتی ہے تو جواب اثبات میں ہوگا' لیکن اگر حکومت الٰہیہ کو اس سعی وکوشش کے مترادف بنایا جائے' جو قرون وسطٰی کے یورپ کی تاریخ کے ذریعے سے روشناس عوام ہوئی' یعنی پادریوں کے نظام کو برتر واعلٰی سیاسی قوت سونپ دینا' تو جواب قطعی طور پر نفی میں ہوگا۔ وجہ صرف یہ کہ اسلام میں پادریوں جیسا کوئی نظام موجود ہی نہیں اور نہ کوئی ایسا ادارہ ہے' جسے مسیحی کلیسا (یعنی رسمی وظائف واصول کا ایک منظم مجموعہ) کا مترادف سمجھا جائے۔ ہر بالغ مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ ہر مذہبی وظیفہ انجام دے۔ کوئی فرد یا گروہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اسے مذہبی وظائف کی بجا آوری میں کوئی خاص تقدس حاصل ہے' لہٰذا اسلامی ماحول میں حکومت الٰہیہ کی اصطلاح (مغربیوں کے مفہوم کے اعتبار سے) سراسر بے معنی ہے۔

غرض اسلامی تصورات وادارات پر غیر اسلامی اصطلاحات کا اطلاق حد درجہ غلط فہمی کا موجب ہوگا۔ اسلامی نظریے میں عمرانیات کا ایک خاص مفہوم ہے' جس کی مثال کہیں نہیں ملتی اور اس کی تعبیر صرف اسلام ہی کے اندر اور اسی کی اصطلاحات کے مطابق کامیابی سے کی جاسکتی ہے۔ اس اصول سے انحراف کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے اکثر مسائل سے متعلق بحث اسلامی قانون کی رو سے مبہم ہوجاتی ہے۔

سیاسی اسلامی اوضاع

اسلام تصورات حکومت ومملکت کے لیے غیر اسلامی مصطلحات کا اطلاق ہی اسلامی سیاسی قانون کا مطالعہ کرنے والے کے لیے غلط فہمی کا موجب نہیں' اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمان تاریخی نمونوں کو وثوق کے ساتھ ہمارے آئندہ نشوو ارتقاء کے لیے وسیلہء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہنمائی سمجھتے ہیں۔

میں گزشتہ باب میں ایک بنیادی تقاضے پر زور دے چکا ہوں' جو ہر مملکت کو پورا کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر وہ متعلقہ عوام کی راحت و بہبود محفوظ نہیں رکھ سکتی' یعنی انسان کے عمرانی و ذہنی ارتقاء کے لیے پوری گنجائش مہیا رکھنی چاہیے اور سیاسی قانون کے تصور کو لوچ اور لچک سے محروم نہ کرنا چاہیے۔ اسلامی مملکتوں کی گزشتہ تاریخ اور مثالی اسلامی مملکت کے اوضاع و وظائف کے باب میں دور حاضر کے بعض عام تصورات پر نظر بازگشت ڈال لی جائے تو ہم پر سختی وسخت گیری کا وہ عنصر واضح ہو جائے گا' جو صحت مند عمرانی نشو و ارتقاء کے تقاضوں سے بجا طور پر غیر مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا اشارہ سیاسی نظریے کے متعلق محض ان قدیم اسلامی تصانیف کی طرف نہیں' جن میں صرف عباسی دور کے سیاسی احوال منعکس ہوئے اور ان میں فرمانروایان وقت کے مفاد کی تسکین کا اضطراب جا بجا نمایاں ہوتا ہے۔ میں خصوصیت سے اس فکر و نظر کا ذکر کر رہا ہوں' جو مسلمانوں میں پہلے بھی رائج رہا اور اب بھی رائج ہے' یعنی مملکت کی صرف ایک وضع اسلامی کہلانے کی مستحق ہے' جو چاروں خلفائے راشدین کے ماتحت رونما ہوئی اور اس نمونے سے ذرا سا بھی انحراف مملکت کی اسلامی حیثیت میں لازماً کمی کر دے گا۔ اس سے زیادہ غلط خیال کوئی نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم قرآن و سنت کے سیاسی احکام کا جائزہ معروضی اور خارجی نقطہ نگاہ سے لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کے لیے کوئی خاص وضع و ہیئت مقرر نہیں کی گئی[1]' یعنی شریعت نے کوئی

۱۔ کوئی خاص وضع و ہیئت مقرر نہ کرنا عین مصلحت پر مبنی تھا۔ اس وقت دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف اوضاع کی حکومتیں قائم تھیں۔ گزشتہ چودہ سو سال میں بھی یہی صورت قائم رہی اور آج بھی تمام ممالک کے نظام ہائے حکومت ایک وضع کے نہیں۔ اسلام کا مقصود و مدعا یہ تھا کہ حکومت کی وضع کوئی بھی ہو' اگر اس میں مخلوق کی راحت و بہبود کے وہ مقاصد اور تقاضے پورے ہوتے ہیں' جو اسلام کے نزدیک ضروری تھے تو حکومت کا اصل مقصد پورا ہوتا رہے گا۔ اگر کوئی خاص وضع مقرر کر دی جاتی تو اسلامی مقاصد کی تکمیل کے لیے پہلے اس وضع کا نفاذ ضروری ہوتا' اس کے بعد اصل مقاصد کی تکمیل کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ طریقہ سراسر خلاف مصلحت تھا۔ اسلام نے ہر وضع و ہیئت میں بنیادی مقاصد کے لیے سرگرمی سے کارکردگی پر زور دیا ہے تاکہ خلق خدا کی راحت و بہبود کا انتظام جلد ہو جائے۔ تاہم جس حد تک محض وضع و ہیئت کا تعلق ہے' یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا رجحان جمہوریت کی طرف ہے' کیونکہ جمہوریت میں مخلوق کی راحت و بہبود کے مقاصد احسن طریق پر پورے ہوتے ہیں۔ کوئی وضع و ہیئت معین نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی وضع و ہیئت ہو' لیکن اصل مقصد کے لیے کام جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قطعی نمونہ تجویز نہیں کیا' جس سے مطابقت ایک اسلامی مملکت کے لیے لازم ہو' بلکہ دستوری نظریے کی تفصیلات ہی بیان نہیں کیں' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن وسنت سے جو سیاسی قانون مستنبط ہوتا ہے' وہ بے حقیقت ہے۔ یہ قانون بہت واضح' روشن اور مثبت ہے اور ایک ایسے سیاسی منصوبے کا خاکہ اس میں صاف صاف آ گیا ہے' جس پر انسانی زندگی کے تمام احوال واوقات میں عمل ہوسکتا ہے۔ تمام احوال واوقات میں قابل عمل ہونے ہی کی بنا پر یہ منصوبہ خاکے کی صورت میں پیش کیا گیا اور اسے تفصیلات سے معرا رکھا گیا۔ انسان کی سیاسی' عمرانی اور اقتصادی ضرورتیں ہنگامی ہوتی ہیں اور ان میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر قوانین ادارت کو بے لوچ اور بے لچک رکھا جاتا تو ظاہر ہے کہ وہ تغیر کے طبعی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور شریعت نے ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الٰہی قانون ہے اور اس میں تاریخی ارتقاء کی حقیقت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ اس کے مطابق مومن کو گنتی کے وسیع سیاسی اصول بتا دیے گئے ہیں۔ ان کے سوا دستور سازی کی سرگرمیوں اور حکومت کے کاروبار کا وسیع دائرہ ویسے کا ویسا چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے وقتی حالات سامنے آ جائیں' اجتہاد کی بنا پر ان کے مطابق روز بروز قانون بنائے جا سکتے ہیں۔

جو مسئلہ پیش نظر ہے' اس کے تعلق میں بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کی وضع و ہیئت ایک نہیں اور ہر دور کے مسلمان خود سوچ سکتے ہیں کہ کونسی وضع و ہیئت ان کی ضرورتوں کے لیے زیادہ سازگار ہے' البتہ یہ ضروری ہے کہ جو وضع و ہیئت اور جو ادارے منتخب کیے جائیں' وہ اجتماعی زندگی کے متعلق شریعت کے واضح اور غیر مشتبہ قوانین کے عین مطابق ہوں۔

یہ سیاسی شرعی قوانین (جن پر ابھی تفصیل سے بحث ہوگی) ان انتظامی اداروں اور طور طریقوں میں پوری طرح واضح ہوئے' جو خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھے اور اسی وجہ سے ان (خلفائے راشدین) کی مملکت ہر لحاظ سے اسلامی تھی' لیکن ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اسلامی دولت مشترکہ اس زمانے میں جس غیر مکتوب دستور کی پابند رہی' اس میں ملک داری کے متعلق واضح شرعی قوانین کے ساتھ ساتھ چند اور قوانین بھی رائج تھے' جو وقت کے حکمرانوں نے قرآن وسنت کی اپنی تعبیر کے مطابق وضع کر لیے تھے۔ گویا یہ قوانین اجتہاد کی بنا پر تھے۔ ان کے علاوہ ہمیں خلفائے راشدین کے عہد میں اور بہت سے انتظامی و

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانونی احکام ملتے ہیں' جو بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن وسنت سے ماخوذ نہ تھے' بلکہ حکومت کی صلاحیت کار اور مفاد عامہ کے پیش نظر عقل سلیم کی بنا پر بنا لیے گئے (مثلاً حضرت عمرؓ نے دیوان یا محکمہء مال ایرانیوں کے نمونے پر قائم کیا یا عرب مجاہدین کے لیے نو مفتوح علاقوں میں ارضی ملکیت کے حصول کی ممانعت کر دی)۔ یہ تمام قوانین وقت کی آئینی حکومت کی طرف سے جاری ہوئے تھے اور وہ شرعی قانون کے منطوق یا مفہوم کے قطعاً خلاف نہ تھے' لہٰذا انہیں اس وقت کے لیے ٹھیک قانونی حیثیت حاصل تھی' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لیے جائز سمجھا جائے۔

صحابہ کرامؓ کا نمونہ

ہم نے جو کچھ کہا' اس کے خلاف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

> ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ بڑے صحابی اسلام کے داخلی مقاصد کو سمجھنے میں ہم سے بدرجہا بہتر نہ تھے؟ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم ملک داری کے معاملات میں ان کے عمل کی زیادہ پابندی اپنے لیے لازم قرار دے لیں؟ کیا خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید نہیں فرمائی تھی کہ ہمیں صحابہؓ کی روش کے مطابق چلنا چاہیے؟''

یہ اعتراض ایک جذباتی پس منظر لیے ہوئے ہے' جس میں بڑی قوت ہے اور میں بحث کے اسی مرحلے پر اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کرامؓ کے نمونہء عمل کی پیروی پر بھی زور دیا ہے' محض اسی لیے نہیں کہ انہوں نے بہت سے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت میں بسر کیے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوضاع واطوار سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے' اس لیے بھی کہ ان میں سے بعض کے کردار و روش نے حد درجہ رفیع و بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ تاہم اکابر صحابہؓ کی پیروی کے لیے ہمارے اخلاقی فرض کا تعلق ان کے کردار و روش سے ہے' یعنی ان کی روحانی وعمرانی دیانت' ان کی بے نفسی' ان کی مثالیت پسندی اور رضائے باری تعالیٰ کے لیے ان کی بے چون وچرا سرافگندگی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ متاخر زمانے کے لوگ ملک داری سے تعلق رکھنے والے معاملات میں بھی صحابہؓ کے طریق کار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی پیروی کریں۔ اس کا سبب پہلے بیان کیا جا چکا ہے' یعنی یہ طریق کار مختلف اعتبارات سے وقتی تقاضوں اور انفرادی اجتہاد کا نتیجہ تھا اور اسے ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے تنہا شرعی احکام پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اجتہادی فیصلوں میں حکمران کی آزادی رائے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق وتوثیق متعدد روایات سے واضح ہے' لیکن جیسی وضاحت حضرت معاذؓ بن جبل کے ساتھ مشہور گفتگو سے ہوئی' غالباً اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

ان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لما بعثه الی الیمن قال ''کیف تقضی اذا عرض لک قضاء؟'' قال ''اقضی بکتاب اللہ'' قال ''فان لم تجد فی کتاب اللہ؟'' قال ''فبسنت رسول اللہ؟'' قال فان لم تجد فی سنت رسول اللہ '' قال اجتهد برائی لا..........

یرضی به رسول اللہ.

جب اسے (معاذؓ بن جبل کو) عامل کی حیثیت میں یمن بھیجا جا رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ جو مقدمے تیرے پاس لائے جائیں گے' ان کا فیصلہ کیونکر کرے گا؟ معاذؓ نے جواب دیا'' میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کروں گا۔'' پوچھا۔ اور اگر تجھے خدا کی کتاب میں (کسی خاص معاملے کے متعلق) کچھ نہ ملے''؟ کہا'' تو خدا کے رسول کی سنت کے مطابق فیصلے کروں گا۔ پوچھا۔'' اور اگر خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کوئی چیز نہ ملے؟'' تو معاذؓ نے جواب دیا'' میں بے تامل اپنی رائے سے کام لوں گا۔'' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ کے سینے پر تھپکی دی اور فرمایا'' تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کو ایسی بات کہنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کی خوشی کا باعث ہوئی۔

تخیل کی کسی پرواز کی بنا پر حضرت معاذؓ کا مطلب یہ نہیں سمجھا سکتا کہ ان کے (معاذؓ) کے قانونی یا انتظامی فیصلے ــــ جو اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئے تھے ــــ اس مجموعہ قوانین کا مستقل جزو بن جائیں گے' جو قرآن وسنت کے نصوص پر مبنی تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشائے مبارک بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت معاذؓ کے آئندہ اجتہادی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیصلوں کو کسی جماعت یا گروہ کے لیے واجب قرار دے دیں' جو معاذؓ کے علاقائی دائرہ عمل سے باہر تھے۔ بعد میں آنے والی نسلوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت پیش آ سکتی تھی (اور کئی مرتبہ پیش آئی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کا فیصلہ کسی خاص معاملے میں دوسرے صحابیؓ کی رائے سے بالکل مختلف ہوتا۔ صحابی نے کہا: ''جن معاملات میں مجھے کوئی چیز قرآن وسنت کے نصوص سے نہیں ملے گی' میں اپنی عقل سلیم کے مطابق فیصلے کروں گا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی منظوری دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب صرف یہ ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی کسی صحابیؓ نے اپنے کسی اجتہاد کو' خواہ وہ عقائد سے متعلق ہو یا اعمال سے' کسی بھی شخص کے لیے مذہبی اعتبار سے واجب نہ سمجھا۔ ان بزرگوں کے قلوب انتہائی عجز وانکسار کی برکات سے لبریز تھے اور ان میں سے کبھی کسی نے اپنے متعلق تمام ادوار کے لیے قانون ساز کا رتبہ مخصوص نہ کیا' لیکن بعد کی نسلوں کے لوگ انہیں یہی درجہ دیتے رہے۔ جن لوگوں نے تقدس وتقویٰ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل الشان صحابہؓ کے احترام میں یہ سب کچھ کیا' انہوں نے ناتمامی کا وہ عنصر پیش نظر نہ رکھا' جو فطرت انسانی میں مضمر ہے اور سیاسی معاملات میں صحابہ کرامؓ کے ہر اجتہادی جزیے کو ایسی قانونی مثال قرار دے لینا' جو ملت پر ہمیشہ کے لیے واجب ہو غلط ہوگا۔ نہ شریعت میں اس کے لیے کوئی وجہ جواز موجود ہے' نہ عقل سلیم اس کی تائید کرتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کے احترام واکرام میں خفیف سی بھی کمی کا شائبہ گوارا کیے بغیر ہم اعتراف کر سکتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعے سے جو کچھ ہمارے سامنے آیا' وہ کتنے ہی جلیل القدر فرد کی سعی و کاوش کا نتیجہ کیوں نہ ہو' بہر حال اس فرد کے ماحول اور کیفیت علم پر مبنی ہوگا اور علم ـــ خصوصاً معاشرتی اور عمرانی معاملات سے تعلق رکھنے والا علم ـــ انسانی کردار کی رفعت و بلندی نہیں' بلکہ اس کے تاریخی تجربے کے ماحصل پر منحصر ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہمیں جو تاریخی تجربہ ہوا' وہ ہماری ذاتی صلاحیت کے بغیر ہی اتنا وسیع ہے کہ تیرہ سو سال پیشتر کے صحابہ کرامؓ کا تجربہ اتنا وسیع نہ تھا۔ ہمیں صرف ان بے شمار سائنٹفک تصورات کا بے پناہ نشو وارتقاء ہی پیش نظر رکھ لینا چاہیے' جو درمیانی صدیوں میں ہوا اور اندازہ ہو جائے گا کہ ہم بعض اعتبارات سے اسلام کے عمرانی و اقتصادی قضیوں کا زیادہ گہرا مفہوم سمجھ لینے کے بہتر اہل ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے لیے یہ صورت ممکن ہی نہ تھی۔ وجہ یہ کہ ہمیں ان بزرگوں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا اور ان

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیرہ صدیوں کے فراہم شدہ تاریخی و ذہنی تجربے سے بھی مستفید ہو سکتے ہیں' جو صحابہ کرامؓ کے لیے مستقبل کے ناقابل گزر کہر میں مستور تھا[(۱)]۔

ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسلام کا پیغام دوامی ہے اور اسے انسان کی ذہنی تحقیق و کاوش کے لیے ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے[(۲)]۔ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ دنیا کی ترقیات کے متعلق علم جتنا بڑھتا جائے گا' ہم اسلامی قانون کی حکمتوں کو سمجھنے کے زیادہ اہل بنتے جائیں گے۔ بنابریں قرآن و سنت کے مطابق ہم حق اجتہاد کے محض مجاز ہی نہیں' بلکہ ہم اس پر مامور ہیں' خصوصاً ان معاملات سے متعلق' جن میں شریعت حقہ یا تو بالکل خاموش ہے یا اس نے ہمیں صرف عمومی اصول بتا دیے ہیں۔

ہم انتظامی صلاحیت پیدا کرنے اور عمرانی انصاف محفوظ رکھنے کے بہترین ذرائع کی تلاش میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم جن نتائج پر پہنچے' وہ اس عمرانی و اقتصادی ماحول اور وقت پر موقوف ہوتے ہیں' جن میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں' لہٰذا منطقی اعتبار سے اسلامی مملکت میں قانون سازی کے بڑے حصے کو وقتاً فوقتاً گرد و پیش کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے۔ اس سے قانون سازی کے ان عناصر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا' جو قرآن و سنت کے نصوص کے مطابق واضح ہو گئے اور وہ مومن کے نقطہ نگاہ سے غیر متبدل ہیں۔ اس طرح اس بنیادی شرط پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ اس نوع کی ساری متبدل اور دائرہ شریعت سے باہر قانون سازی غیر مشتبہ شرعی احکام کے خلاف نہ جانی چاہیے۔ ساتھ ساتھ اس میں بھی شبہ نہیں کہ خلافت راشدہ سے تیرہ سو سال بعد جو اسلامی دستور بنایا جائے گا' وہ اس سے بجا طور پر مختلف ہو

۱۔ (مصنف تصوف کے نظام تربیت سے محروم رہے تھے، اس لیے وہ صحابہ کی روحانی عظمت کا فہم حاصل نہ کر سکے:

لغت شناس نہ ای دلبرا خطا اینجا است

ہمارا تاریخی شعور بجا، مگر صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تلاوت سننے، کتاب وحکمت کی تعلیم پانے اور تزکیہ حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا اس کا بدل کہاں اور کسے نصیب ہو سکتا ہے۔ پھر جناب رسول پاک کی ''توجہ'' اور ''صحبت'' سے جو کچھ نصیب ہو سکتا ہے وہ صرف صحابہ ہی کا مقدر تھا۔ صحابہ نے دین کی تعلیم Academic انداز میں حاصل نہ کی تھی، فطرت کے انداز میں حاصل کی تھی۔ پھر دین اُن کی فطرت کا حصہ ہو گیا تھا۔ وہ دین کے مطلوب ومقصود کو دل کی آنکھ سے دیکھ سکتے تھے اور دیکھتے تھے۔ اُن کے اجتماعی فیصلے دین میں حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ دراصل تصوف کا لذت شناس ہوئے بغیر صحابہ کی عظمت کا صحیح ادراک ممکن نہیں)۔ (مدیر)

۲۔ دراصل اسلام ذہنی تحقیق کا ہی معاملہ نہیں، دل کا معاملہ بھی ہے۔ اسلام میں شریعت ہی نہیں طریقت بھی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا ہے' جو خلافت راشدہ کے لیے اور اس زمانے میں رائج تھا۔

یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ ایک وقت کے سیاسی تقاضوں اور اس سے پیشتر کے سیاسی تقاضوں کے درمیان اختلاف کے سلسلے میں تیرہ صدیوں کا فصل ضروری نہیں' صرف چند عشروں کے انقضاء کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اپنے انتظامی ڈھانچے میں مختلف تبدیلیاں کر لیں اور یہی ڈھانچا تھا' جسے ہم آج کل دستور کہتے ہیں۔ مثلاً ہم رئیس مملکت کے انتخاب کا مسئلہ لیتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان اصول انتخاب کے باب میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ جیسا کہ ہمیں ابھی معلوم ہوگا' اس معاملے کے متعلق شریعت کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ بے شک یہ واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا رئیس اعلیٰ انتخاب سے مقرر کیا جائے' لیکن شریعت میں انتخاب کا کوئی خاص طریقہ معین نہیں کیا گیا' اس لیے صحابہ کرام طریق انتخاب کو بجا طور پر دائرہ شریعت سے باہر سمجھتے تھے اور امت کے بہترین مفاد کے مطابق یہ طریقہ مختلف ہو سکتا تھا۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب اکابر مہاجرین [1] وانصار [2] نے کیا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آخری وقت میں حضرت عمرؓ کو جانشین نامزد کر دیا۔ امت نے بعد میں اس کی توثیق کر دی۔ (اس معاملے میں توثیق انتخاب کے مترادف تھی)۔ جب حضرت عمرؓ کا آخری وقت آیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ممتاز اصحاب میں سے چھ کی ایک انتخابی جماعت نامزد کر دی اور انہیں یہ کام سونپا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو جانشین منتخب کر لیں۔ اس جماعت نے حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا' جنہیں امت نے حضرت عمرؓ کا صحیح و جائز جانشین مان لیا۔ حضرت عثمانؓ کی وفات (شہادت) پر مسجد النبیؐ کے ایک اجتماع میں حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور امت کی اکثریت نے حضرت علیؓ کی اطاعت کا حلف اٹھا لیا۔

غرض جن چار عہد ہائے حکومت کو ہم خلافت راشدہ کہتے ہیں' ان میں سے ہر ایک میں مملکت کے نہایت اہم مسئلے کے متعلق دستور مختلف رہا اور انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طریقے

۱۔ مہاجرین یعنی وہ مکی مسلمان' جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پہنچے۔

۲۔ انصار (لغوی معنی ناصر و مددگار) وہ مدنی مسلمان' جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مدینہ منورہ پہنچنے پر آپ کے جان نثار معاون بن گئے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے رئیس مملکت کا انتخاب ہوتا ہے' وہ ایک نہایت اہم دستوری مسئلہ ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس معاملے میں جس اختلاف پر اتفاق کیا' اس اختلاف کا تعلق حلقہ انتخاب سے بھی تھا اور طریق انتخاب سے بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں مملکت کا دستور وقتاً فوقتاً تبدیل کیا جا سکتا تھا اور اس وجہ سے اس کی اسلامیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا تھا۔

علاوہ بریں یہ سمجھنا ٹھیک نہ ہوگا کہ خلفائے راشدین کی مساعی تمام اسلامی مقاصد کی تکمیل تھیں اور ان میں وہ امور بھی شامل تھے' جن کا تعلق فن ملک داری سے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام ایک دائمی تکرار کی دعوت کے سوا کچھ نہ ہوتا' کیونکہ ہمارے لیے پیش رووں کے اعمال کی پیروی کے سوا کوئی کام نہ رہتا' حالانکہ اسلام درحقیقت دائمی ترقی کی دعوت ہے' عمرانی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی' لہٰذا سیاسی لحاظ سے بھی اسے ترقی ہی کی دعوت سمجھنا چاہیے۔

خلافت راشدہ اسلامی فن ملک داری کا نہایت جلیل القدر آغاز تھا۔ بعد کی صدیوں میں کوئی حکومت اس سے آگے نہ بڑھ سکی' بلکہ اس کا نمونہ قائم بھی نہ رکھ سکی' تاہم یہ صرف آغاز تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی مسند نشینی سے حضرت علیؓ کی وفات (شہادت) تک دولت مشترکہ اسلامیہ وضع وساخت کے نقطہ نگاہ سے برابر حالت تغیر میں رہی۔ ہر نئی فتح اور ہر نیا انتظامی تجربہ اساساً اس کے لیے نمو وارتقاء کا نیا پیغام تھا۔ ایک پشت میں یہ نظام عرب کے حدود سے بڑھتے بڑھتے بہت وسیع ہو گیا اور اس کی حدیں شمالی افریقہ سے وسط ایشیا کے قلب تک پہنچی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں یہ مملکت صرف ان گروہوں تک محدود تھی' جن کا پیشہ کھیتی باڑی اور گلہ بانی تھا۔ ان کی ضرورتیں بہت معمولی اور ان کے مسائل نسبۃً مستقل تھے۔ پھر یہ مملکت نہایت پر پیچ بیزنطینی اور ساسانی تہذیبوں کی وارث بن گئی۔ جب حکومت کی تمام قوتیں' فوجی استحکام اور کم از کم انتظامی صلاحیت قائم رکھنے کے لیے وقف رہنی چاہیے تھیں' اس میں ہر روز سیاسی اور اقتصادی دائروں کے اندر نئے حیرت انگیز مسائل رونما ہو رہے تھے۔ حکومت کو اکثر وقت کے وقت فوری فیصلے کرنے پڑتے تھے اور ان میں سے زیادہ تر فیصلے خالصۃً تجرباتی حیثیت کے تھے۔ خلفائے راشدین سے تیرہ سو سال بعد اس پہلے اور نہایت جلیل الشان تجربے پر ٹھہر جانا اور یہ سوچنا کہ اسلامی مملکت کا نظام ٹھیک اسی وضع وہیئت کا ہو اور اس کے ادارے بھی ویسے ہی ہوں' جیسے ان کی (خلفائے راشدین کی) مملکت میں نمایاں ہوئے' حقیقی تقویٰ کا فعل نہ ہوگا' بلکہ اسے صحابہ کرامؓ کی تخلیقی کوشش سے روگردانی سمجھا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے گا۔ وہ پیشرو اور عملدار تھے۔ انہوں نے راستہ ہموار کیا۔ اگر ہم حقیقۃً ان کی پیروی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ان کا نا تمام کام از سر نو سنبھال لیں اور اسی تخلیقی جذبے سے اس کی تکمیل کے لیے کوشاں رہیں۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا؟

اصحابی امانة لامتی (۱)

میرے ساتھی ایک امانت ہیں جو میری امت کے حوالے ہوئی۔

www.KitaboSunnat.com

۱۔ صحیح مسلم بہ روایت ابو بردہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب:

حکومت بہ رضائے عوام و مجلس شوریٰ

اسلامی مملکت کے مقاصد

اسلامی مملکت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد و تعاون کے لیے ایک سیاسی نظام مہیا کر دے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلاَ تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۱)

اور دیکھو سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری ہوئی خندق ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو (ذرا پاؤں پھسلا اور شعلوں میں جا گرے) لیکن اللہ نے تمہیں اس حالت سے نکال لیا اور زندگی و کامرانی کے میدانوں میں پہنچا دیا) اللہ اس طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم (منزل مقصود کی) راہ پالو اور دیکھو ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو کامیابی حاصل کرنے

۱۔ سورہ آل عمران آیات ۱۰۳-۱۰۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ اسلامی مملکت بجائے خود مقصد ونصب العین نہیں' بلکہ محض ایک ذریعہ ہے۔ مقصد ونصب العین یہ ہے کہ وہ ملت نشو وارتقاء پائے' جس کے افراد مساوات و انصاف کے داعی ہوں۔ حق کے لیے باطل کے خلاف جدوجہد کریں یا زیادہ واضح الفاظ میں ایک ملت کا نشو وارتقاء ہو' جس کے افراد ایسے معاشرتی حالات پیدا کریں اور انہیں قائم رکھیں' جن کے تحت افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے خدا کے فطری قانون یعنی اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اس نصب العین کے حصول کی ایک ناگزیر شرط یہ ہے کہ افراد ملت کے درمیان اخوت کا زبردست احساس پیدا ہو جائے اور ترقی پائے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ. (۱)

مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

اس آیت کی توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار مواقع پر فرمائی۔

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً. (۲)

مومن مومن کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو عمارت کے مختلف حصوں کی ہوتی ہے۔ ہر حصہ دوسرے کے لیے باعث تقویت ہے۔

المسلم اخ المسلم لا یظلمه ولایسلمه' ومن كان فی حاجة اخيه كان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربته من كرباة يوم القيامة ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة. (۳)

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر خود ظلم کرتا ہے' نہ کسی کو ظلم کرنے کا موقع دیتا ہے۔ جو بھائی ضرورت کے وقت دوسرے بھائی کی مدد کرے' اللہ تعالیٰ ضرورت کے وقت اس کی مدد کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان سے مصیبت دور کرے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبتوں میں کمی

۱۔ سورہ حجرات آیت ۱۰۔

۲۔ بخاری ومسلم بہ روایت ابوموسیٰ

۳۔ بخاری ومسلم بہ روایت عبداللہؓ بن عمرؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کو رسوائی سے بچاتا ہے' خدا قیامت کے دن اسے رسوائی سے بچائے گا۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس اخوت کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟ یقیناً اس کی بنیاد قبائلی یا قومی وفاداری نہیں ہو سکتی' جو غیر اسلامی گروہوں میں سیاسی اجتماع کی واحد بنیاد ہے اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سچے مومن کے لیے نازیبا قرار دے کر حقارت سے ٹھکرا دیا۔

لینتھین اقوام یفتخرون بابائھم الذین ماتوا' انما ھم لیکونن اھون علی اللّٰہ من الجعل الذی یدیہ الخرء بانفہ' ان اللّٰہ قد اذھب عنکم عصبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالاباء انما ھو مومن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو ادم و ادم من تراب.(۱)

یہاں ایسی قومیں ہیں جو مرے ہوئے آباء واجداد پر فخر کرتی ہیں۔ وہ اللہ کی نگاہ میں اس سے بھی زیادہ حقیر ہیں جتنا حقیر سیاہ کیڑا ہوتا ہے جو گوبر کا ٹکڑا لے کر اپنے نتھنوں سے اوپر نیچے کرتا ہے(۲)۔ دیکھو خدا نے تم سے اہل جاہلیت کی عصبیت ختم کر دی۔ ساتھ ہی آباؤ اجداد پر فخر بھی گیا۔ اب انسانوں کی دو ہی قسمیں رہ گئیں۔ خدا سے ڈرنے والے مومن یا بدنصیب گنہگار' تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

قومیت ہر شکل میں مساوات انسانی کے بنیادی اسلامی اصول کے خلاف ہے' لہٰذا اسے اسلامی اتحاد کی ممکن بنیاد تسلیم کرنا سراسر خارج از بحث ہے۔ قرآن وسنت کے مطابق یہ اتحاد مثالی وضع کا ہونا چاہیے' جو اصل ونسل کی مصلحتوں سے بالا ہو۔ ایک ایسی برادری' جس کے تمام افراد صرف مشترک عقیدے اور مشترک اخلاقی نقطہ نگاہ کے شعور کی بنا پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوں۔ اسلامی تعلیمات میں افکار ونظریات کا ایسا ہی اشتراک انسانی گروہ بندی کے لیے ایک مناسب بنیاد مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک قوم کے حقیقی یا خیالی مفاد کو اخلاقی مصلحتوں سے بالا رکھنے کی مذمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ سخت الفاظ میں فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا۔

۱۔ ترمذی ابوداؤد بہ روایت ابوہریرہؓ

۲۔ سیاہ گبریلا (جعل) مرغی کے چھوٹے انڈے جتنا ہوتا ہے۔ عرب کے بیابانوں میں عام ملتا ہے۔ یہ سوکھے ہوئے گوبر یا لید کے ٹکڑے جمع کر کے انہیں لڑھکاتا ہوا اپنے بل تک لے جاتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیس منا من دعا الی عصبیۃ' ولیس منا من قاتل علیٰ عصبیۃ' ولیس منا من مات علیٰ عصبیۃ. (۱)

جس نے قبائلی عصبیت کی دعوت دی' وہ ہم میں سے نہیں' جو قبائلی عصبیت کے لیے لڑا' وہ ہم میں سے نہیں اور جو قبائلی عصبیت پر مرا' وہ ہم میں سے نہیں۔

جب ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے پوچھا کہ قبائلی عصبیت کی توضیح فرما دیجئے' جس کے باعث کوئی شخص بداہتہً دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان تعین قومک علی الظلم. (۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تو کسی غیر منصفانہ مقصد کی بنا پر اپنے قبیلے کی مدد کرے۔

ایک اور موقع پر قبائلی عصبیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کسی گروہ سے کسی فرد کی محبت اس وقت تک قبائلی عصبیت نہیں بنتی' جب تک یہ محبت دوسرے گرہوں پر ظلم کا باعث نہ بن جائے۔" (۳)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انصر اخاک ظالماً او مظلوماً "فقال رجل "یارسول اللہ! انصره مظلوماً فکیف انصره ظلماً ' قال "تمنعه عن الظلم" فذلک نصرک ایاه. (۴)

اپنے بھائی کی مدد کرو' خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شخص نے عرض کی "اے اللہ کے رسولؐ! میں مظلومی کی حالت میں تو مدد کر سکتا ہوں' لیکن ظلم کی حالت میں مجھ سے امداد کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے"؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارا فرض ہے کہ بھائی کو ظلم سے روکو۔ یہ ظلم کی حالت میں بھائی کی مدد ہوگی۔"

۱۔ ابوداؤد بہ روایت جبیر بن مطعم۔

۲۔ ابوداؤد بہ روایت واثلہ ابن اسقع۔

۳۔ احمد بن حنبلؒ اور ابن ماجہ بہ روایت عبادہ ابن کثیر۔

۴۔ بخاری و مسلم بہ روایت انسؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یوں زمین پر بے انصافی کا انسداد اور انصاف کا قیام اسلام کے پیغام کی علت غائی بن گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (۱)

مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کے ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی۔ تم نیکی کا حکم دینے والے' برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا' بدی سے روکنا) ہے' جو ملت اسلامیہ اور اخوت اسلامیہ کی اخلاقی قدر ہے۔ انصاف کے اسی نصب العین ۔۔۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں سے یکساں انصاف ۔۔۔ پر اسلامی مملکت کا تصور قائم ہے اور یہ نہ ہو تو اس تصور کے لیے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ مملکت یا حکومت اس نصب العین کے حصول کا صرف سیاسی وسیلہ ہے۔

اسلامی مملکت کے تصور کا مفہوم اور وجہ جواز سامنے لائیں تو مندرجہ ذیل اصول واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قانون اسلام کو اس غرض سے ملک کا قانون بنانا کہ انصاف کا بول بالا ہو۔

۲۔ عمرانی اور اقتصادی روابط کا انتظام ایسے طریق پر کرنا کہ ہر فرد آزادی اور وقار سے زندگی بسر کر سکے' اپنی شخصیت کی تمام امکانی ترقیوں میں اسے کم سے کم رکاوٹ پیش آئے اور اس کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی ہو۔

۳۔ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے ایسے موقع بہم پہنچانا کہ وہ محض عقائد ہی نہیں' بلکہ زندگی کے عملی دائرے میں بھی اسلام کے اخلاقی مقاصد پورے کر سکیں۔

۴۔ تمام غیر مسلم شہریوں کے لیے کامل جسمانی حفاظت کے علاوہ مذہب' ثقافت اور عمرانی نشوارتقاء کی پوری آزادی حاصل ہو۔

۵۔ ملک کو بیرونی حملوں اور داخلی افراتفری سے محفوظ رکھنا۔

۶۔ دنیا بھر میں تعلیمات اسلام کی تبلیغ کرنا۔

اگر کوئی مملکت یا حکومت ان مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہے تو اس کے متعلق بجا طور پر

۱۔ سورہ آل عمران آیہ ۱۱۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہا جاسکتا ہے کہ وہ روئے زمین پر خدا کی خلافت کا حق ادا کر رہی ہے۔۔۔ کم از کم اس حصہ ارض میں جو فعلاً اس کے دائرہ اقتدار میں ہے۔

بنیادی اصول

شرعی نقطہ نگاہ سے ایک اسلامی مملکت کے لیے وجہ جواز۔۔۔ یعنی مسلمانوں کے لیے اطاعت ووفاداری کے مذہبی وجوب کا دعویٰ۔۔۔ قرآن کے اس بنیادی حکم پر مبنی ہے:

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ.(۱)

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں حکم واختیار رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے یوں اختصار وجامعیت سے اسلامی مملکت کی نوعیت کے متعلق متعدد اہم اصول واضح کر دیے۔

۱۔ ایسی مملکت کا اولین فرض یہ ہے کہ شریعت کے احکام اپنے زیر تحویل علاقوں میں نافذ کرے۔ اس فرض پر قرآن نے مزید زور یوں دیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ.(۲)

جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی مملکت حقیقی معنی میں اسلامی نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے دستور میں ایک قانون اس مضمون کا شامل نہ ہو کہ عوامی معاملات کے متعلق تمام شرعی قوانین ہر قسم کی قانون سازی کی ایسی بنیاد ہوں گے، جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ مملکت کے دائرہ اختیار کو عوامی معاملات تک محدود کر دینے کا مطلب یہ نہیں، شریعت حقہ کا دائرہ بھی اسی طریق پر محدود کیا جاسکتا ہے۔ شریعت بے شک وشبہ انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے، خواہ وہ عوامی ہو یا نجی، لیکن ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ حکومت ایک عمرانی نظام ہے اور اسے صرف انسانی زندگی کے عمرانی پہلو سے تعلق ہے، لہٰذا اس اعتبار سے

۱۔ سورہ نساء آیت نمبر ۵۹

۲۔ سورہ مائدہ آیت نمبر ۴۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شریعت کو ایک مجموعہ قوانین ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ (۱)

۲۔ اگر چہ یہ مجموعہ قوانین ہمیشہ کے لیے اصل نظام اور اسلامی مملکت کے کاروبار کی بنیاد بنا رہے گا' لیکن اس کی نوعیت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ان تمام قوانین کا سر چشمہ نہیں بن سکتا' جن کی ضرورت نظم ونسق کے لیے پیش آتی رہے گی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' عوامی معاملات کے متعلق شرعی ضوابط کے ساتھ ہمارے بنائے ہوئے ہنگامی اور قابل ترمیم قوانین بہ طور ضمیمہ شامل ہوتے رہیں گے۔ ایسے تمام قوانین کے سلسلے میں یہ بنیادی شرط قائم رہے گی کہ وہ کسی بھی اعتبار سے کسی شرعی قانون کے منطوق یا مفہوم کے خلاف نہ جائیں گے' کیونکہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ. (۲)

جب خدا اور رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو کسی ایماندار مرد یا ایماندار عورت کا کام یہ نہیں کہ کوئی دوسرا راستہ اپنے اختیار اور مرضی سے چن لے۔

اس لیے دستور میں واضح کر دینا چاہیے کہ کوئی ہنگامی قانون یا انتظامی حکم ـــ خواہ وہ لزوم پر مبنی ہو یا رخصت پر ـــ قطعاً درست نہ ہوگا' اگر وہ شریعت کے کسی ضابطے کے خلاف جائے گا۔

۳۔ قرآن کے اس حکم ـــ ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو'' ـــ کے فوراً بعد یہ الفاظ آتے ہیں ـــ ''اور ان لوگوں کی جو تم میں حکم و اختیار رکھتے ہیں'' ـــ یعنی مسلمانوں میں سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملت اسلامیہ سے باہر کی کسی طاقت کا کوئی حکم کسی مسلمان پر اخلاقاً واجب نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس صحیح اصول پر قائم شدہ اسلامی حکومت کی اطاعت شہریت کا ایک اصول ہے' جسے تمام مہذب قوموں نے ایک بنیادی چیز تسلیم کیا ہے' لیکن یہ اہم امر پیش نظر رکھ لینا چاہیے کہ اسلامی نظام سیاست کے مطابق یہ فرض اس وقت تک فرض رہتا ہے' جب تک شریعت کے ممنوع اعمال کو جائز نہ قرار دیا جائے اور اوامر کی ممانعت نہ کی جائے۔ ایسی صورت

۱۔ شرعی قوانین کے متعلق چھٹا باب ملاحظہ فرمایئے۔

۲۔ سورہ احزاب آیت نمبر ۳۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا ہو تو ملت کے لیے حکومت کی اطاعت واجب نہیں رہتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمادی۔

السمع و الطاعة على المرء المسلم فى ما احب و كره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع و لا طاعة:(۱)

مسلمان کے لیے سننا اور اطاعت کرنا، خواہ اسے حکم پسند ہو یا ناپسند، صرف اس وقت تک واجب ہے جب تک کسی ایسے امر کا حکم نہ دیا جائے جو گناہ ہو۔ اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سننا واجب ہے نہ اطاعت کرنا۔

دوسرے لفظوں میں ملت کے لیے اپنے میں سے اس صاحب امر و حکم کی اطاعت مشروط ہے۔ صاحب امر و حکم کے لیے لازم ہے کہ اس کا کوئی عمل خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری سے باہر نہ ہو(۲)۔ اس اصول سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملت کے فرائض میں حکومت کے کاروبار کی نگرانی بھی شامل ہے۔ صحیح اور درست کاموں کے لیے رضامندی کا اظہار ضروری ہے۔ جب حکومت راہ راست سے انحراف کرے تو کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ یوں ایک اسلامی مملکت کی نہایت اہم بنیادی خصوصیت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ملت کی رضا

۱۔ بخاری و مسلم بہ روایت ابن عمرؓ

۲۔ حضرت شیخ الہند نے اس آیت کے متعلق حاشیے میں لکھا ہے۔ "حکام کی اطاعت جبھی واجب ہوگی جب وہ حق کی اطاعت کریں گے۔ حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبیدار یا قاضی یا سردار لشکر یا جو کوئی کسی کام پر مقرر ہو اُن کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسولؐ کے خلاف حکم نہ دیں۔ اگر کوئی خدا اور رسول کے حکم صریح کے صریح خلاف کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مانے۔" (قرآن مجید مترجم و محشیٰ ۱۱۴)

اولی الامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ اور امام یا صاحب امر و حکم ہے۔ اسلامی جمہوریت کا صدر یا ہیئت حاکمہ بھی اس مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن مجید میں اس کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے۔ اہل علم و تحقیق کا بیان ہے کہ نزول قرآن کے وقت کی عربی اصطلاحات میں غور و فکر سے بھی یہی معنی واضح ہوتے ہیں۔ اقوال صحابہؓ و تابعینؒ بھی انہیں معنی کے موید ہیں۔ امام بخاری کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

پھر فعل "اطیعوا" اللہ اور رسولؐ کے ساتھ آیا، مگر اولی الامر کے ساتھ اس کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ خلیفہ یا امام یا صاحب امر و حکم یا ہیئت حاکمہ کی اطاعت بالاستقلال واجب نہیں، صرف اس وقت تک واجب ہے جب تک ان کی طرف سے خدا و رسولؐ کے احکام کے مطابق ہدایتیں جاری ہوں۔ اگر خدا و رسولؐ کے مقرر فرمائے ہوئے راستے سے کوئی حاکم یا خلیفہ یا امیر یا صدر یا ہیئت حاکمہ انحراف کرے تو اطاعت قطعاً نہ کرنی چاہیے۔ خدا اور رسولؐ ہی کے حکموں کی طرف لوٹنا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مندی کے تابع رہے۔

۴۔ رضائے عامہ کا اصول یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایسی حکومت قوم کے آزادانہ انتخاب کی بنا پر وجود میں آنی چاہیے۔ نیز وہ آزادانہ انتخاب کی پوری نمائندہ ہو۔ قرآن مجید میں ''تم میں سے'' (منکم) کا یہ ایک اور پہلو ہے۔ اس کا تعلق پوری ملت سے ہے' اس کے کسی خاص طبقے یا گروہ سے نہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مملکت کی قیادت و سیادت انتخاب پر مبنی ہونی چاہیے اور انتخاب کے سوا کسی ذریعے سے اقتدار حکومت اختیار کر لیا۔۔۔ مثلاً پیدائش کے مصنوعی و خیالی حق کی بنا پر جو موروثی بادشاہی میں مستعمل ہے۔۔۔ خود بخود باطل ہو جاتا ہے' اگرچہ مدعی مسلمان ہو' کیونکہ یہ اقتدار ملت اسلامیہ پر باہر سے عائد کیا جاتا ہے۔''(۱)

اقتدار مملکت کا ماخذ

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے (جو سیاسی فلسفے کے نقطہ نگاہ سے دلچسپ ہے) کہ اسلامی مملکت کن مآخذ سے اقتدار حاصل کرتی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا ''نظری'' نہیں' جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔

یقیناً ایک عام شہری اس وقت تک اقتدار مملکت کے مآخذ میں خواہ مخواہ قیاس آرائی نہیں

۱۔ (از مصنف) ممکن ہے' بعض خوانندگان کتاب موروثی بادشاہی کے اس علی الاطلاق رد پر اعتراض کریں اور کہیں کہ اصطلاح ''سلطان''۔۔۔ جسے آج کل بادشاہ کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔۔۔ متعدد صحیح احادیث میں استعمال ہوئی ہے' جن کا تعلق سیاسی مسائل سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس اصطلاح کا استعمال موروثی بادشاہی کے کاملاً غیر اسلامی ادارے کے لیے ایک موزوں عذر بنا رہا اور اس پر صدیاں گزر گئیں' تاہم یہ عذر بالکل باطل ہے۔

کلاسیکی عربی میں۔۔۔ جو قرآن و احادیث کی زبان ہے۔۔۔ سلطان کے معنی ایک حجت اور ایک قاطع دلیل کے ہیں۔ ثانوی اعتبار سے اس کے معنی حکم یا اختیار کے سمجھے جاتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ملت کی سیاسی زندگی کے تعلق میں جہاں ''سلطان'' کا لفظ ارشاد فرمایا اسے بہرحال ان معنی میں استعمال فرمایا جن معنی میں ہم آج کل ''حکومت'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور صحابہ کرام کا معمول بھی یہی رہا۔ اس اصطلاح سے ایک ایسا شخص مراد لینا جسے کاروبار حکومت سونپ دیا جائے۔۔۔ اکثر مانند ایک بادشاہ۔۔۔ اس کے ابتدائی معنی کی قطعی تحریف ہے' جو کلاسیکی دور کے بعد عمل میں آئی (مثال کے لیے ملاحظہ ہو لین کی عربی انگریزی ڈکشنری حصہ چہارم' صفحہ ۱۴۰۵۔۱۴۰۶)۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا' جب تک مملکت کا انتظامی کاروبار اور ادارے اس کی زندگی کے شخصی طور طریقوں اور اقتصادی پیش رفت کے ممکنات پر سازگار اثر ڈالتے رہتے ہیں یا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ساز گار اثر پڑ رہا ہے۔ بہ این ہمہ کوئی مورخ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ شہری اپنی مملکت سے جو اخلاقی اقدار وابستہ کرتے ہیں' وہی آخر اس کے (مملکت کے) روحانی اقتدار کی بقا میں فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں اور اسی پر عمرانی نظم کی بقا موقوف سمجھی جاتی ہے۔ کوئی بیرونی سیاسی وضع وہیئت' خواہ کتنی ہی بہتر ہو' بجائے خود اصل مقاصد پورے نہیں کرسکتی۔ سیاسی اوضاع کی افادی حیثیت انجام کاران کے روحانی محتویات پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ان محتویات میں نقص ہو تو نتائج ملت کے لیے تباہی خیز ہوسکتے ہیں' لہٰذا اغلب یہی ہے کہ صدیوں سے عمرانی نظم اور روح شہریت کا فقدان ملت اسلامیہ میں اقتدار واختیار مملکت کی تصوراتی بنیادوں کے متعلق بڑی حد تک ابتری کا باعث ہوا ہے اور یہ ابتری افسوس ناک تاریخی واقعات کے ایک سلسلے کا نتیجہ ہے۔ غالباً اسی ابتری کا نتیجہ تھا کہ مسلمان صدیوں سے بدقماش فرمانرواؤں کے ہاتھوں ہر ظلم اور ہر استحصال بالجبر کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

ہمارے عہد کی سیاسی فضا بداہتہً بے انصافی کے سامنے سر جھکائے رکھنے کی قائل نہیں۔ مغرب کے سیاسی نظریات کے زیر اثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ اقتدار واختیار کا اصل سرچشمہ عوام ہیں اور انہیں کی مرضی کے مطابق مملکت کے اداروں اور حالات وقت کے مطابق قانون سازی کے دائرے کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ دور حاضر کے جو مسلمان اسلامی مملکت کے نظریے کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں' ان میں سے بھی خاصی تعداد اس امر کی مدعی ہے کہ عوام کی متحدہ مرضی (اجماع) ہی اختیار واقتدار کا سرچشمہ ہے اور اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ذیل کو بنیاد بنایا جارہا ہے۔

ان اللّٰہ لایجمع امتی علی ضلالۃ۔(۱)

خدا میری امت کو گمراہی پر کبھی جمع نہ کرے گا۔

بہت سے مسلمان اس حدیث کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی ملت ـــ یا کم از کم اس کی اکثریت ـــ کسی امر پر متفق ہوجائے تو وہ ہر حال سے راہ ہدایت پر ہوگی' لیکن یہ نتیجہ قطعاً صحیح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منفی ہے' مثبت نہیں۔ اس کا مطلب وہی ہے' جو حضور

۱۔ ترمذی بہ روایت عبداللہ بن عمرؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے فرمادیا' یعنی تمام مسلمان کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوں گے اور ان میں ایسے افراد یا گروہ ہمیشہ موجود رہیں گے' جو غلط راستہ اختیار کرنے والوں سے اختلاف کریں گے اور صحیح راہ عمل پر چلنے کے لیے اصرار کرتے رہیں گے۔

غرض جب کبھی ہم اسلامی سیاسی فکر کے سلسلے میں رائے عامہ کا کلمہ زبان پر لائیں تو ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور گزشتہ صدیوں کی غیر اسلامی مطلق العنانی کی جگہ ملت کے غیر محدود اقتدار کا تصور قائم نہ کر دینا چاہیے' جو ویسا ہی غیر اسلامی ہے۔

اسلامی مملکت کا جواز ایک خاص نظریے پر عوام کے رضا کارانہ اتفاق رائے سے پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ جواز سلطنت کے انتظامی طور طریقوں میں رضائے عامہ سے مشروط ہے۔ اس حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں' لیکن ایک اسلامی معاشرے میں ایک خاص طرز حکومت پر عوام کی رضامندی اور عمرانی وسیاسی تعاون کا ایک خاص منصوبہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ان عوام نے اسلام کو ایک الٰہی فرمان کی حیثیت میں تسلیم کر لیا' لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بجائے خود اقتدار کے حامل بن گئے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۔ (۱)

کہ اے خدا! اے شاہی و جہانداری کے مالک! تو جسے چاہے ملک بخش دے جس سے چاہے' ملک لے لے۔ تو جسے چاہے عزت دے' تو جسے چاہے ذلیل کر دے تیرے ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے اور تیری قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

یوں ہر اقتدار کا حقیقی سرچشمہ خدا کی رضا ہے' جس کا اظہار شریعت کے احکام و اوامر میں ہوا ہے۔ ملت اسلامیہ کے اقتدار کی حیثیت نیابت وتفویض کی ہے' یعنی یہ خدا کی طرف سے ایک امانت ہے' لہٰذا مملکت اسلامیہ۔۔۔۔ جو' ہم دیکھ چکے ہیں' یہ رضائے عامہ کی بنا پر وجود میں آئی ہے اور رضائے عامہ ہی کے ضبط ونظم کے تابع ہے..... کا اقتدار واختیار آخر خدا سے حاصل

۱- سورہ آل عمران آیت نمبر ۲۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے۔ [1] اگر یہ شریعت کے احکام کے عین مطابق ہو' جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ارشاد شہریوں کی اطاعت کی حقدار ہو سکتی ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی. [2]

جو شخص میری فرمانبرداری کرتا ہے۔ وہ خدا کی فرمانبرداری کرتا ہے اور جو شخص میرا نافرمان ہے' وہ خدا کا نافرمان ہے اور جو شخص امیر (رئیس مملکت) کی اطاعت کرتا ہے' میری اطاعت کرتا ہے اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے' وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔

جب ملت کی اکثریت ایک خاص لیڈر کو حکومت کی باگ ڈور سونپنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو ہر مسلمان شہری کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اخلاقاً اس فیصلے کا پابند رہے' اگرچہ وہ اس کی ذاتی ترجیحات کے خلاف ہو۔

رئیس مملکت

چونکہ اسلامی مملکت کا مقصد کسی نسلی یا ثقافتی گروہ کے حق خود مختاری کا قیام نہیں' بلکہ انسانی معاملات میں اسلامی قانون کا عملاً قیام ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ جو شخص قانون کو الہامی اور آسمانی مانے گا' یعنی مسلمان ہو گا' اسی کو رئیس کا منصب سونپا جا سکے گا۔ چونکہ اسلامی مملکت کے بغیر پوری اسلامی زندگی کا وجود ہی ممکن نہیں' اس لیے کسی مملکت کو اس وقت تک حقیقی اسلامی مملکت قرار نہیں دیا جا سکتا' جب تک اس کے نظم و نسق کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو' جن کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ اسلام کے الہامی قانون کو بہ طیب خاطر مانتے ہیں۔

ان ملکوں میں اس اصول پر عمل پیرائی طبعاً کسی مشکل کا باعث نہ ہو گی' جن کی آبادی

۱۔ یہ سب کچھ درست ہے، لیکن کون سی چیز ہے جو خدا کی نہیں؟ اس بارے میں تفصیل غیر ضروری ہے۔ زمین' مکان' ملکیت' کاروبار غرض ہر شے اصلاً خدا ہی کی ہے۔ اسی کا عطیہ ہے۔ انسان اسے خدا کی رضا کے مطابق استعمال کرے تو خدا کا شکر گزار بندہ ہو گا۔ رضا کے مطابق استعمال نہ کرے تو اسے کفران نعمت کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں منطقی موشگافیوں کی ضرورت نہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ اقتدار کے حامل عوام ہی ہیں، البتہ اگر وہ مسلمان ہیں تو لازم ہے کہ قرآن و سنت کی پیروی کریں۔ نہیں کریں گے تو ان کا دعویٰ اسلام باطل قرار پائے گا۔

۲۔ بخاری و مسلم بہ روایت ابو ہریرہؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سراسر یا تقریباً سراسر اسلامی ہے (مثلاً دولت عربیہ سعودیہ اور افغانستان) تاہم جن اسلامی ملکوں میں معتد بہ غیر مسلم اقلیتیں موجود ہیں اور اسلامی ملکوں کی اکثریت کی کیفیت یہی ہے۔۔ وہاں مندرجہ بالا اصول کسی قدر تشویش کا باعث بن سکتا ہے' کیونکہ یہ مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان مستلزم امتیاز ہے' لیکن امتیاز کا خطرہ محض نظریے تک محدود ہے' عملی حکومت میں ایسا کوئی خطرہ نہیں' کیونکہ جہاں جہاں مسلمانوں کو زبردست اکثریت حاصل ہے (اور ایسے ہی ملک بجا طور پر اسلامی کہلانے کے مستحق ہیں) وہاں ریاست کی مملکت خود بخود مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ دور حاضر کے سیاسی فکر کے رو سے' جس پر مغربی تصورات وتعصبات کا گہرا اثر ہے' مذہب کی بنا پر نظری امتیاز بھی بہت سے مسلمانوں کے لیے ناخوشگوار ہو سکتا ہے۔ جو غیر مسلم اقلیتیں ان کے دوش بدوش رہتی ہیں' ان کا تو ذکر ہی نہ کرنا چاہیے۔ بہ ایں ہمہ ابتدا ہی میں بے تکلف اعتراف کر لینا چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ایک خاص امتیاز قائم کیے بغیر ہم قرآن وسنت کے مطابق اسلامی مملکت یا مملکتیں قائم ہی نہیں کر سکتے' لہٰذا اس موضوع کے متعلق گول مول باتیں کہنا ملت اسلامیہ کے نقطہ نگاہ سے بھی اور گردوپیش کی غیر مسلم دنیا کے نقطہ نگاہ سے بھی بددیانتی کا موجب ہوگا۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم غیر مسلم شہریوں کے خلاف عام دوائر زندگی میں بھی امتیاز قائم رکھیں گے یا قائم رکھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہر قسم کی آزادی اور تحفظ کا انتظام لازم ہے' جس کے لیے ایک مسلمان شہری بجا طور پر مطالبہ کر سکتا ہے' البتہ غیر مسلموں کو قیادت کا کلیدی منصب نہیں سونپا جائے گا۔ اس حقیقت سے گریز ممکن نہیں کہ کسی غیر مسلم شہری کی ذاتی دیانت اور مملکت سے وفاداری کتنی ہی اعلیٰ اور مسلم کیوں نہ ہو' لیکن نفسیاتی وجوہ کی بنا پر اس سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اسلام کے نظریات مقاصد کے لیے بہ صمیم قلب کام کر سکے گا اور نہ انصافاً اس سے ایسا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی نظریاتی تنظیم (خواہ وہ مذہب پر مبنی ہو یا محض اصول پر) کی باگ ڈور کسی ایسے آدمی کے سپرد نہیں کی جاتی سکتی' جو ان نظریات کا معترف نہ ہو۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک غیر کمیونسٹ کو سوویٹ روس میں کوئی سیاسی کلیدی منصب دیا جا سکے گا؟ مملکت کی قیادت عالیہ کا تو ذکر ہی نہ کرنا چاہیے۔ ہرگز نہیں اور منطقی اعتبار سے یہ بالکل درست ہے' کیونکہ جب تک کمیونزم مملکت کی نظریاتی بنیاد بنی رہے گی' صرف وہی افراد اس کی انتظامی پالیسی کو مقاصد کے مطابق چلانے کے لیے قابل اعتماد سمجھے جا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکیں گے' جو بلا تقید ان مقاصد سے وابستہ ہوں۔

مندرجہ بالا امر کو حکم نص (اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم) سے ملا کر دیکھا جائے تو صاف صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی مملکت میں جو لوگ اقتدار اعلیٰ کے حامل ہوں اور جن کے ذمے پالیسی کی تشکیل ہو' ان کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ محض اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں' جہاں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے' بلکہ دستوری قانون کے پیش نظر اعتقاداً بھی انہیں مسلمان ہونا چاہیے۔ اگر ہم اسلام کو اپنی زندگیوں میں ایک غالب عامل بنانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں تو ہم میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ کھلم کھلا اعلان کر دیں: "ہم اس جھوٹی لبرلزم کے مطالبے کو مان کر اپنا مستقبل خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں' جو انسانوں کے مذہبی عقائد کو کوئی اہمیت دینے کی منکر ہے۔ اس کے برعکس انسان کے جو بھی عقائد ہیں' وہ ہمارے نزدیک ہمارے ملک میں پیدائش کے اتفاقی حادثے یا ہمارے ملک کی شہریت کے حصول سے بدرجہا اہم ہیں۔

غرض یہ واضح ہے کہ مملکت اسلامیہ کا رئیس مسلمان ہونا چاہیے۔ قرآن نے جو اصول پیش کیا ہے۔ یعنی:

> إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ.(۱)
>
> تحقیق تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ مکرم ومحترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار اور نیک خصلت ہے۔

اس اصول کے مطابق رئیس کا انتخاب ذاتی صلاحیت ہی کی بنا پر ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں نسل' خاندانی اصل یا سابقہ عمرانی درجے کی مصلحتیں قطعاً خارج از بحث ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اسمعوا واطيعوا وان امر عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة.(۲)
>
> سنو اور اطاعت کرو' اگرچہ تم پر ایک حبشی کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کے دانے کی طرح ہو یعنی جو بدوضع ہو۔

۱- سورہ حجرات' آیت نمبر ۱۳۔

۲- بخاری ومسلم بہ روایت انسؓ۔

مشابہت سیاہی اور چھوٹائی میں ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امیدوار امیر[1] کے لیے مسلمان اور مسلمانوں میں سے نہایت پرہیزگار ہونے کی شرط کے علاوہ ۔۔۔۔ جس کا مطلب بظاہر یہ ہوا کہ اسے بالغ' دانشمند اور کردار میں بلند ہونا چاہیے ۔۔۔۔ شریعت نے اس منصب کے لیے اور کوئی شرط نہیں لگائی ۔ نہ انتخاب کا کوئی خاص طریقہ وضع کیا' نہ انتخاب کرنے والوں کی کوئی حد مقرر کی، لہٰذا یہ تمام تفصیلات ملت کو وقت کے تقاضوں اور اپنے بہترین مفاد کے مطابق تجویز کرنی چاہیں ۔ امیر کی میعاد امارت کے مسئلے پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے چند سال کی مدت مقرر کر دی جائے (اور اس کے دوبارہ انتخاب کا حق بھی باقی رکھا جائے) یا امیر کا منصب اس وقت تک قائم رکھا جائے' جب تک امیر عمر کی ایک خاص حد پر نہ پہنچ جائے' لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض وفاداری اور مستعدی سے انجام دیتا رہے ۔ تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس منصب کو تاحیات اسی کے قبضے میں رہنے دیا جائے' مگر یہ شرط ہر حال میں قائم رہے گی کہ امیر اسی وقت منصب سے دست بردار ہو جائے گا' جب واضح ہو جائے گا کہ وہ وفاداری سے فرائض انجام نہیں دے رہا یا خرابی صحت اور دماغی کمزوری کے باعث مستعدی قائم نہیں رکھ سکتا ۔ منصب امیر کی میعاد کے متعلق اس وسعت کو اس لچک اور لوچ کی ایک اور مثال سمجھنا چاہیے جو قرآن وسنت کے سیاسی قانون میں مضمر ہے ۔

اصول مشورہ

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' شریعت نے ہماری اجتماعی زندگی کے متعدد اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے متعلق تفصیلات مہیا کرنے سے عمداً احتراز کیا ہے' لہٰذا عام معاملات کے لیے مسلسل قانون سازی کی ضرورت بالکل بدیہی ہے ۔ اسلامی مملکت میں یہ قانون سازی نظم ونسق کے ان متعدد مسائل سے متعلق ہوگی' جن کے بارے میں شریعت نے کچھ نہیں کہا یا صرف عام اصول بیان کر دیے ہیں' تفصیلی قانون نہیں بنائے ۔ ان حالات میں یہ ملت کا کام ہے کہ آزادانہ غور وفکر (اجتہاد) سے کام لے کر متعلقہ قانون کی تفصیلات مہیا کرے' لیکن ضروری ہے کہ تفصیلات اسلامی قانون کی روح اور قوم کے بہترین مصالح کے مطابق ہوں ۔ یہ کہنا

۱۔ امیر کا لقب سہولت کی غرض سے استعمال کیا گیا' اس کے معنی کمانڈر' قائد اور صاحب اختیار کے ہوسکتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس ملت کے لیے زیادہ تر دو لفظ استعمال فرمائے ایک امیر' دوسرا امام ۔ اس لقب کو کسی دوسرے لقب پر ترجیح دینے کے لیے مسلمان شرعاً مجبور نہیں ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحصیل حاصل ہے کہ ہماری زندگی کے اجتماعی پہلو سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق اجتہادی قانون سازی انفرادی اختیارات تمیزی کے حوالے نہیں کی جا سکتی۔ یہ فیصلے پوری ملت کے اجماع پر مبنی ہونے چاہئیں (اس سلسلے میں یہ بھی شامل ہے کہ جب کسی معاملے کی بابت کوئی صاحب علم یا گروہ علماء کوئی اجتہادی فیصلہ کرلے اور وہ امر زیر غور و بحث ہو تو امت اس پر صاد کرے۔)

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ عام اجماعی قانون کون بنائے؟ ظاہر ہے' پوری ملت سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر قانون سازی کرے گی' لہٰذا ضروری ہے کہ امت قانون سازی کے اختیارات کسی ایک فرد یا افراد کی محدود تعداد کے حوالے کردے اور اس کے فیصلے سب کے لیے واجب القبول ہوں۔ گویا سوال کی صورت یہ ہوئی کہ کس فرد یا افراد کو یہ کام سونپا جائے؟

متعدد مسلمانوں کی رائے ہے ـــ اور خلفائے راشدین کی مثال کی بنا پر بظاہر یہ درست معلوم ہوتی ہے ـــ کہ عام غیر شرعی قانون سازی کے اختیارات ایک فرد یعنی امیر کے حوالے ہونے چاہئیں۔ چونکہ اسے ملت نے آزادانہ طریق پر امارت کے لیے منتخب کیا' اس لیے وہ محض نظم و تنفیذ ہی نہیں' بلکہ قانون سازی میں بھی ملت کی نمائندگی کا اہل بن سکتا ہے۔ تاہم متعدد دوسرے مسلمانوں کا نظریہ یہ ہے ـــ تاریخی شہادت سے اس کی بھی توثیق ہوتی ہے ـــ کہ کسی ایک فرد کے ہاتھ میں اتنے اختیارات دے دینا ہمیشہ شدید خطرات کا موجب ہوا ہے۔ ایک حقیقت واضح ہے' کوئی فرد کتنا ہی روشن دماغ' راستباز اور نیک نیت کیوں نہ ہو' اس سے فیصلوں میں بہ آسانی غلطیاں ہو سکتی ہیں' مثلاً اس بنا پر کہ اس کا ذاتی رجحان کسی ایک معاملے کی طرف تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی مجلس متعدد افراد پر مشتمل ہو تو تصادم آراء کی بدولت ـــ اور ان آراء پر ہونے والی بحث کے باعث ـــ ہر مسئلے کے مختلف پہلو بخوبی واضح ہو جانے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ یوں قانون سازی میں انفرادی رجحان کا خطرہ اگر بالکل ختم نہ ہوگا تو کم از کم اس میں بڑی حد تک تخفیف ہو جائے گی۔ محض یہی نہیں' بلکہ مطلق العنان اقتدار صاحب اقتدار میں اکثر خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ اپنے مفاد یا اپنے طرفداروں کے مفاد کے لیے اقتدار کے غلط استعمال پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر مملکت کے لیے قانون سازی کے اختیارات ایک مجلس قانون ساز کے حوالے ہونے چاہئیں' جسے ملت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف اس غرض سے منتخب کرے۔

غرض مسلمان آزاد ہیں۔ وہ چاہیں تو امیر کو مطلق اختیارات دے دیں اور چاہیں تو مجلس شوریٰ کی حکومت قائم کرلیں (مجلس شوریٰ کا نام اسمبلی رکھا جائے یا پارلیمنٹ یا کوئی اور نام تجویز کرلیا جائے) جب اس مسئلے پر ہم زیادہ گہری نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو متبادل چیزوں میں انتخاب کی نمائشی آزادی موجود ہی نہیں۔ قرآن مجید نے معاملے کا فیصلہ نہایت قطعی حکم کے ذریعے سے کردیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۱)

ان کا (مومنوں کا) اجتماعی کاروبار (امر) باہم مشورے سے انجام پاتا ہے۔

یہ صریح نص ہے اور اتنی جامع ہے کہ سیاسی زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر حاوی ہے۔ نیز اتنی واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ من مانی تعبیر کی کوئی کوشش اس کے مفہوم میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں لفظ ''امر'' اجتماعی حیثیت کے تمام معاملات سے متعلق ہے' لہٰذا اسے اسلامی مملکت کی حکومت قائم کرنے کے طریقے سے بھی تعلق ہے' یعنی پورے سرکاری اقتدار کی تہہ میں انتخابی اصول کارفرما ہے۔ نیز جملے کی صورت یوں رکھی گئی کہ مسلمانوں کا پورا اجتماعی کاروبار باہم مشورے سے انجام پاتا ہے' گویا سیاسی کاروبار مشورت پر مبنی ہی نہ رکھا' بلکہ مشورت ہی کے مترادف قرار دیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مملکت کے تمام اختیارات قانون سازی ایک مجلس کے حوالے ہونے چاہئیں' جسے ملت خاص اس مقصد کے لیے منتخب کرے۔

مجلس شوریٰ

زیر غور قرآنی حکم میں ''باہم'' کا جو لفظ آیا ہے' وہ پوری ملت سے متعلق ہے' لہٰذا قانون ساز مجلس ۔۔۔ یا اسلامی تاریخ کی معروف اصطلاح میں ''مجلس شوریٰ'' ۔۔۔ پوری ملت کی حقیقی نمائندہ ہونی چاہیے۔ ملت میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ ایسی نمائندہ حیثیت صرف آزاد انتخابات ہی کے ذریعے سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ گویا مجلس شوریٰ کے ارکان کا انتخاب زیادہ سے زیادہ وسیع حق رائے کی بنا پر ہونا چاہیے اور یہ حق رائے مردوں اور عورتوں دونوں کو ملنا چاہیے۔ اس حق رائے کی وسعت اور ووٹروں کے ضروری اوصاف وخصائص۔۔

۱۔ سورہ شوریٰ آیت نمبر ۳۸۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امیدواروں کے اوصاف وخصائص کی طرح۔۔ ایسے تفصیلی معاملات ہیں' جن کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی واضح قانون مہیا نہیں کیا' لہٰذا یہ معاملات ملت کے اختیارات تمیزی پر موقوف رکھے گئے۔ ملت وقت کے تقاضوں کی روشنی میں جو فیصلے چاہے کر لے۔

کہا جا سکتا ہے کہ پوری ملت کے ذریعے سے مجلس کا انتخاب ـــ بلاواسطہ یا بالواسطہ۔۔ کرانے کے بجائے اگر امیر ارکان نامزد کر دے تو وہ خاص نمائندہ بن جائے گی' کیونکہ خود امیر نے رائے عامہ کی بنا پر منصب واقتدار حاصل کیا اور اسے رضائے ملت کا پیکر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے لیے اسلامی تاریخ سے حمایت کی کتنی ہی شہادتیں پیدا کر لی جائیں' لیکن اگر ہم یہ حقیقت پیش نظر رکھیں کہ قانون ساز مجلس کی ہیئت ترکیبی کا طریقہ مملکت کے نہایت اہم معاملات میں شامل ہے تو مذکورہ بالا نظریے کی کمزوری صاف نمایاں ہو جائے گی۔ اگر ہم اجتماعی معاملات کے متعلق شوریٰ کے قرآنی اصول کو بطور بنیاد تسلیم کرتے ہیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ مجلس کی ترکیب وترتیب کا عمل بھی شوریٰ ہی پر مبنی ہونا چاہیے اور یہاں شوریٰ کو زیادہ سے زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مختلف الاجزاء معاشروں میں' جیسا کہ ہمارا معاشرہ ہے شوریٰ' انتخاب ہی کی شکل اختیار کر سکتا ہے' جس میں متعلقہ امیدواروں کے خصائص ومحاسن پر کھلم کھلا بحث ہوگی اور آخر میں ووٹوں کے ذریعے سے فیصلہ کیا جائے گا۔ شریعت نے طریق انتخاب کا فیصلہ نہیں کیا' اسے ملت کے فیصلے پر موقوف رکھا' خواہ انتخاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ' ووٹ قابل منتقلی رکھے جائیں یا نہ رکھے جائیں' نمائندگی علاقائی ہو یا متناسب وغیرہ۔

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عوامی تقررات کے متعلق ایک اہم نکتہ واضح کر دیا ہے اور یہ نکتہ انتخابی تقررات پر بھی حاوی ہے' یعنی اپنے حق میں لوگوں کو ہم رائے بنانے کی ممانعت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> لاتسال الامارة فانك ان اعطيتها عن مسئلة وكلت اليها وان اعطيتها عن غير مسئلة اعنت عليها.(۱)
>
> منصب اقتدار (امارۃ) کے بارے میں سوال نہ کر کیونکہ اگر تجھے مانگنے پر ملا تو تجھے اپنے وسائل پر چھوڑ دیا جائے گا۔ یعنی خدا کی طرف سے کوئی مدد نہ ہوگی اور اگر بغیر سوال کے ملا تو خدا کی طرف سے تیری مدد ہوگی۔

۱- بخاری ومسلم بہ روایت عبدالرحمٰن ابن سمرہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشائے مبارک یہ تھا کہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے خدا کی طرف سے مدد ضروری ہے۔ اس کے برعکس خدا کی طرف سے مدد نہ ملے تو نتیجہ لازماً ناکامی ہوگا' اگرچہ کسی شخص کے ذاتی وسائل کتنے ہی زیادہ ہوں۔ اس نکتے کی مزید توضیح یوں ہوتی ہے کہ جب کسی شخص نے کسی انتظامی عہدے کے متعلق درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی درخواست کے قبول سے برابر انکار فرماتے رہے۔ مثلاً جب ایک صحابی کسی سرکاری ملازمت کے لیے درخواست گزار ہوئے تو حضور نے فرمایا:

انا لانولی علی ھذا العمل احدا سالہ ولا احداً حرص علیہ۔ (۱)

خدا کی قسم! ہم کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کے لیے درخواست کرے اور نہ کسی ایسے شخص کو جس کے لیے اس کے دل میں حرص ہو۔

غرض اسلامی مملکت کے دستور میں واضح اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص کسی انتظامی عہدے کا خواہاں ہو (ان میں خود رئیس مملکت کا عہدہ بھی شامل ہے) یا مجلس شوریٰ کا ممبر ہونا چاہے اور اپنے حق میں لوگوں کو ہم رائے بنانے کی کوشش کرے تو وہ انتخاب وتقرر کے حق سے خود بخود محروم ہو جائے گا۔ ایسا اعلان روح شریعت کے عین مطابق ہوگا۔ بہت سے معاصر مسلمانوں کی طرف سے شورائی حکومت کے خلاف جو وزنی اعتراض کیا جا رہا ہے' اس دفعہ سے وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آج کل جس شخص کو مقامی لحاظ سے اثر ورسوخ حاصل ہو یا اس کے قبضے میں دولت ہو' وہ حقیقی اوصاف سے بہرہ مندی کے بغیر بھی قانون ساز مجلس کے لیے منتخب ہو جاتا ہے' کیونکہ انتخاب کرنے والوں کو خاص حد تک ہموا بنا سکتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا دفعہ دستور میں شامل ہو جائے تو براہ راست رضا جوئی کی ایسی تمام کوششیں معارکنیت سے محرومی کا باعث بن جائیں گی۔ بے شک کسی نہ کسی ذی اثر امیدوار کے لیے یہ موقع باقی رہے گا کہ حقیقی اوصاف وخصائص سے بے بہرہ ہونے کے باوجود وہ کسی جماعت یا درمیانی فرد کے ذریعے سے اپنے حق میں پروپیگنڈا کرائے اور بہ ظاہر اپنے پروپیگنڈے کے براہ راست التزام سے محفوظ رہے۔ تاہم اتنا کافی ہے کہ اُمیدوار خود انتخابی تقریریں نہ کر سکے گا اور انتخاب کرنے والوں کو براہ راست اپنے حق میں ووٹ دینے کے لیے آمادہ نہ کرے گا۔ محض اتنی پابندی سے

۱- بخاری ومسلم بہ روایت ابوموسیٰؓ

115872

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی اس کا کام خاصا مشکل ہو جائے گا۔ نتیجہ عموماً یہ ہو گا کہ صرف انھیں لوگوں کے لیے کامیابی کے حقیقی مواقع باقی رہ جائیں گے، جنھیں انتخاب کنندوں کے درمیان واقعی بجا احترام حاصل ہو گا اور اس کے لیے ان کی طرف سے کسی طلب کا اظہار نہ کیا جائے گا۔ (۱)

۱۔ مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن ارشادات کا حوالہ دیا ہے وہ کسی خاص تشریح کے محتاج نہیں۔ انسان کے دل میں جس چیز کی رغبت وخواہش پیدا ہوتی ہے وہ نفسانیت سے مبرا نہیں بھی جا سکتی۔ بعض امور میں نفسانیت خاص حدود تک جائز ہے' لیکن ملکی اور قومی معاملات میں انفرادی نفسانیت ہمیشہ خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ جو آدمی کسی عہدے کا طلب گار ہو گا' اس کے پیش نظر عموماً یا تو مالی منفعت ہو گی یا اقتدار کی حرص اس کے لیے محرک بنے گی۔ یہ دونوں چیزیں بے لوث قومی اور ملکی خدمت کے منافی ہیں یا بدرجہا آخر اس خدمت کی قدر و قیمت کم کر دیتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آیا ان ارشادات پر عمل کا وہی نقشہ لازم ہے جو فاضل مصنف نے پیش کیا ہے یا مختلف صورتوں میں بعض پیش بندیاں کر لینے سے بھی اصل مقصد پورا ہو سکتا ہے؟ جہاں معاشرے کا انتظامی ڈھانچا سادہ سا ہو گا اور وہ زیادہ وسیع نہ ہو گا' وہاں عمل کی وہ صورت بے تکلف اختیار کی جا سکتی ہے' جو ظاہر الفاظ سے واضح ہوتی ہے' لیکن پر پیچ معاشرے اور پر پیچ انتظامی ڈھانچے میں یقیناً مشکلات پیش آئیں گی۔ مثلاً فرض کیجیے' کسی محکمے میں ایک خاص درجے کی تعلیم پائے ہوئے لوگ درکار ہیں۔ اس محکمے یا اس افسر کو کیونکر معلوم ہو گا کہ ضرورت کے وقت اس درجے کے تعلیم یافتہ لوگ تحصیل یا ضلع یا صوبے یا ملک میں کتنے ہیں؟ نیز ان میں اور کون کون سے اوصاف ہیں' جو پیش نظر اسامیوں کے لیے زیادہ مفید ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ درخواستیں طلب کیے بغیر یہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ انتخابات کا معاملہ سامنے آ جائے تو کسی کو نمائندہ چن لینا بھی ایسی چیز نہیں کہ ہمارے معاشرے کے حالات مد نظر رکھتے ہوئے سہل اور آسان سمجھ لیا جائے۔ فرض کر لیجیے کہ کسی حلقے کے مختلف گروہ ایک سے زیادہ آدمیوں کو نمائندہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں لازماً مقابلہ پیش آئے گا اور مقابلے میں اپنے اپنے چنے ہوئے نمائندے کی حمایت نیز دوسروں کی مخالفت میں بہت کچھ کہنا پڑے گا اور کم و بیش وہی صورت پیش آ جائے گی' جو آج جا بجا ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ لہٰذا نفس درخواست کو تو ممنوع قرار نہ دینا چاہیے' البتہ ایسی پابندیاں لگا دینی چاہئیں کہ کسی سفارش اور کسی ناواجب پروپیگنڈے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ انتخابات سے بدرجہا زیادہ نظم ونسق کی اسامیاں پر کرنے کے متعلق احتیاط' حق شناسی اور انصاف کی ضرورت ہے' یعنی جن لوگوں کے ہاتھ میں اسامیاں پر کرنے کا کام ہو' انھیں صرف افراد کی زیادہ سے زیادہ موزونیت کے سوا کوئی بھی مصلحت کسی بھی درجے میں متاثر نہ کر سکے۔ راقم الحروف کے نزدیک اصل بنیادی اساس کی حفاظت کے لیے مناسب اہتمام کیے جا سکتے ہیں اور زیادہ اہتمام کی ضرورت صرف ابتدائی دور میں ہو گی۔ جب عوام کے اخلاق سدھر جائیں گے تو اس مقصد کے لیے عمل کی بہترین صورتیں زیادہ یقینی ہو جائیں گی۔ لاریب زیادہ خرابیاں اخلاق کے معیاری نہ ہونے کے باعث پیدا ہوئیں۔ اخلاق سدھر جائیں تو امیدوار اور انھیں مقرر کرنے یا چننے والے خود بخود خلوص' نیک نیتی اور بے لوث خدمات کو شیوہ و شعار بنا لیں گے۔ خرابیاں اس طرح بالکل مٹ جائیں گی یا ان میں اتنی تخفیف ہو جائے گی کہ ان کا معلوم کر لینا اور دور کر دینا ہرگز مشکل نہ رہے گا۔

☆ فاضل مترجم نے ایک خیالی معاشرے کا تصور پیش کیا ہے' جس کا وجود میں آنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ اوامر ونواہی کا وجود ضروری ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلاف رائے

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مجلس شوریٰ کا شغل قانون سازی صرف عوامی ضرورت کے معاملات سے متعلق ہوگا، خصوصاً ان معاملات کے متعلق، جن کے بارے میں نصوص قرآن و سنت کے اندر کوئی قطعی قانون واضح نہیں فرمایا گیا۔ جب مفاد ملت کے لیے کسی قانون کی ضرورت پیش آئے گی تو مجلس شوریٰ کا فرض یہ ہوگا کہ سب سے پہلے مآخذ شریعت میں زیر غور مسئلے کے متعلق کوئی اصول رہنمائی تلاش کرے۔ اگر ایسا اصول مل جائے تو مجلس شوریٰ کا کام یہ رہ جائے گا کہ اس شرعی اصول کے مطابق قانون وضع کرے، لیکن مجلس کو اکثر ایسے مسائل سے واسطہ پڑے گا، جن کے باب میں شریعت بالکل خاموش ہے، یعنی ایسے مسائل، جن کے متعلق نصوص میں نہ تفصیلی ہدایات موجود ہیں اور نہ کوئی عام اصول بتایا گیا ہے۔ ایسے مسائل کے متعلق مجلس کو خود ضروری قوانین وضع کرنے چاہئیں، البتہ اس سلسلے میں روح اسلام اور بہبود ملت کے مصالح پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ارکان مجلس کو نہ صرف قرآن و سنت کے نصوص کا خاصا علم ہونا چاہیے، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ارباب بصیرت ہوں (اولوالالباب) ملت کے عمرانی تقاضوں اور دنیا کے معاملات عموی سے انھیں آگاہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے تعلیم اور بلوغ ایسے اوصاف ہیں، جو قطعاً نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

اگر ارکان مجلس مذکورہ بالا اوصاف سے بہرہ مند ہوں تو غیر اغلب ہے کہ خاص عمرانی صورت حالات کے متعلق وہ ایک ہی نقطہ نگاہ سے غور کریں اور کسی خاص موقع کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو آئینی تدبیریں اختیار کی جائیں گی، ان پر سب کا اتفاق ہوگا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے، کیونکہ انسانوں کا طریق استدلال ایک موضوعی اور داخلی عمل ہے اور اسے صاحب فکر کے طبعی رجحانات، عمرانی پس منظر اور سابقہ تجربات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بہ الفاظ دیگر اس عمل کو ان متعدد اثرات سے الگ کرلینا ممکن نہیں، جن کی کارفرمائی سے ایک انسانی شخصیت تشکیل پاتی ہے اور اختلاف رائے کے بغیر حقیقی ترقی ممکن نہیں، کیونکہ مختلف وضع کے اذہان و عقول ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ایک دوسرے پر محرک اثرات ڈالتے ہیں تو عمرانی مسائل تدریجاً معرض وجود میں آتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ حل کے قریب پہنچتے جاتے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے واضح ہے۔

اختلاف علماء اُمّتی رحمۃ۔ (۱)

میری امت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت (کا نشان) ہے۔

لہٰذا ہمیں اس خیال سے گھبرانا نہ چاہیے کہ ایک اسلامی مملکت میں مجلس شوریٰ کے فیصلے...... دنیا بھر کی دوسری قانون ساز مجلسوں کے فیصلوں کی طرح...... بالاتفاق نہ ہوں گے۔ ہم صرف یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ تمام فیصلے اصول اکثریت کی بنا پر کیے جائیں گے۔ عام قوانین میں صرف اکثریت کافی ہوگی' لیکن غیر معمولی اہمیت کے مسائل میں دو تہائی اکثریت کو ترجیح دینی چاہیے۔ غیر معمولی مسائل میں' جن پر آگے چل کر بحث ہوگی' ترمیم دستور' اعلان جنگ اور ایسے دوسرے مسائل شامل ہیں۔

دور حاضر کے مغرب میں جو نام نہاد جمہوری نظام رائج ہیں' ان میں سے اکثر کی بد یہی کوتاہیوں کے پیش نظر بعض معاصر مسلمان پسند نہیں کرتے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کی سرگرمی محض ووٹوں کی گنتی پر منحصر رکھی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی قانونی قرارداد کا اکثریت کی بنا پر منظور ہو جانا اس کے لازماً درست ہونے کی دلیل نہیں۔ اکثریت کتنی ہی بھاری اور نیک نیت کیوں نہ ہو' یہ امکان ہر وقت رہتا ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہو جائے اور اقلیت تعداد میں کم ہو جانے کے باوجود حق بجانب ہو۔

اس نظریے کی معروضی وخارجی حقانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی قلب سے ہر وقت خطا سرزد ہو سکتی ہے۔ نیز انسان ہمیشہ حق وانصاف کے محرکات کی پیروی نہیں کرتے۔ دنیا کی تاریخ ایسے غلط فیصلوں کی نظیروں سے لبریز ہے' جو خود غرض اور احمق اکثریت نے کیے حالانکہ دانشمند اقلیت تنبیہ کرتی رہی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ ایک قانون ساز مجلس کے اندر فیصلوں میں اکثریت کا اصول ماننے کے سوا متبادل صورت کیا ہے؟ ہر قانون کے سلسلے میں کون یہ فیصلہ کرے گا کہ اکثریت حق بجانب ہے یا اقلیت؟ کس کی رائے کو آخری اور قابل قبول مانا جائے گا؟ کہا جا سکتا ہے کہ آخری فیصلے کا حق امیر کو دے دینا چاہیے۔ لیکن اولاً کسی ایک شخص کو مطلق اختیار دے دینا ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے اصول کے خلاف ہے' جس پر اسلام نے اس درجہ زور دیا۔ ثانیاً کیا یہ ممکن نہیں کہ امیر سے بھی غلطی صادر ہو جائے اور اکثریت کی رائے بالکل

۱۔ سیوطی' الجامع الصغیر۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درست ہو؟ کیا امیر کے نقطہء نگاہ کی توثیق کے لیے کوئی آسمانی ضمانت موجود ہے؟ اصول اکثریت کے نقاد اس کا جواب عموماً یہ دیتے ہیں: ''جب ہم امیر کا انتخاب کریں تو ہمیں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ دانشمند ترین اور راست باز ترین ہو اور محض دانش و راستبازی کی برتری کی بنا پر اس کا منتخب ہونا اس امر کی ضمانت ہے کہ اس کے تمام فیصلے درست ہوں گے۔'' تسلیم، لیکن کیا اسی طرح یہ درست نہیں کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کا انتخاب بھی مسلمان افراد دانشمندی اور راستبازی ہی کی بنا پر کرتے ہیں؟ پھر کیا یہ اس امر کی کافی ضمانت نہیں کہ ان ارکان کی اکثریت جن فیصلوں پر پہنچے گی' وہ ہمیشہ درست ہوں گے؟ قطعاً نہیں۔ امیر یا مجلس دونوں کے تعلق میں کافی ضمانت' مکمل ضمانت کا بدل نہیں بن سکتی اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مکمل ضمانت دینا انسانی دسترس سے باہر ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ جب معقول افراد کی ایک مجلس کسی معاملے پر بحث کرے گی تو ان میں سے اکثریت بہرحال ایسے فیصلے پر پہنچ جائے گی' جو غالباً درست ہو۔ شاید اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر مسلمانوں کو متنبہ کیا:

۱. اتبعوا السواد الاعظم.[1]

سوادِ اعظم کی پیروی کرو۔

۲. علیکم بالجماعة و العامة.[2]

تمہارا فرض ہے کہ جماعت اور اکثریت (العامہ) کے ساتھ رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی عقل و فہم نے اجتماعی فیصلوں کے لیے اصول اکثریت سے بہتر کوئی طریقہ پیدا نہیں کیا۔ بلاشبہ اکثریت سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اور اقلیت بھی غلطی کر سکتی ہے۔ یہ معاملہ کسی بھی نقطہء نگاہ سے دیکھا جائے' انسانی قلب کی خطا کاری انسانی زندگی میں غلطیوں کا صدور ناگزیر بنا دیتی ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ امتحان اور غلطی کے ذریعے سے سبق حاصل کریں اور آئندہ اصلاح کے درپے رہیں۔

۱- ابن ماجہ بہ روایت عبداللہ بن عمرؓ

۲- احمد بن حنبلؒ بہ روایت معاذؓ بن جبل

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب:

حاکمہ اور مقنّنہ کے درمیان روابط

وظائف کا باہم دگر انحصار

مجلس شوریٰ کی ترکیب میں "شاورھم فی الامر" کا جو اصول کارفرما ہے' اس کے رو سے خود امیر بھی قانون سازوں میں شامل ہے' کیونکہ ملت نے اسے رئیس مملکت چنا' لہٰذا وہ اجتماعی نوعیت کے تمام معاملات میں ممتاز ترین نمائندہ محسوب ہونا چاہیے۔ مزید برآں اسلامی نظام سیاسیات میں ہر "امر" کا نقطہء ماسکہ ہونے کے باعث امیر کو مجلس شوریٰ کا محض عام رکن ہی نہیں' بلکہ قائد ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پورے کاروبار میں مجلس کی رہنمائی کرے' نیز مسائل پر غور و بحث کے دوران میں صدارت کے فرائض انجام دے۔ وہ خود بھی صدارت کر سکتا ہے' اپنا نمائندہ بھی اس کام کے لیے نامزد فرما سکتا ہے۔ اس سے ضمناً واضح ہوگیا کہ جو مملکت الٰہی قانون کے تابع ہو' اس میں ہیئت مقننہ اور حاکمہ کے دوائر میں وسیع علیحدگی ممکن نہیں۔ یہ نہایت اہم نکتہ ہے اور سیاسی نظریے میں اسے اسلام کا خاص کارنامہ سمجھنا چاہیے۔

مغرب کی جمہوری مملکتوں میں ہیئت مقننہ اور ہیئت حاکمہ کے دوائر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رکھے جاتے ہیں اور ہیئت حاکمہ کے ذریعے سے اقتدار کے غلط استعمال کے خلاف ایسی علیحدگی کو واحد مؤثر حفاظت قرار دیا جاتا ہے۔ اس مغربی اصول میں اچھائی کے پہلو بھی یقیناً موجود ہیں' کیونکہ ہیئت مقننہ کو برتری اور سیادت کا حق دے کر اسے ہیئت حاکمہ کے عام کاروبار پر بالادست بنا دیا گیا ہے۔ یقیناً اس طرح ہیئت حاکمہ اقتدار کا استعمال غیر ذمہ دار طریق پر کرنے سے روکی اور باز رکھی جا سکتی ہے[1]' تاہم یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرح

ا۔ بالکل صحیح اور یہی امر حاکمہ کو غیر معمولی اختیارات یا غیر ذمہ دارانہ کارروائیوں سے روکنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو یقیناً حاکمہ یا اس کا رئیس مختار مطلق بن سکتا ہے۔ پہلی اسلامی جمہوریت' حاکمہ کے غیر معمولی اختیارات اور ہنگامی حالات میں مقننہ یا شوریٰ کی بے تنظیمی ہی کے باعث یکا یک مستبد اور مطلق العنان بنی اور خلافت علیٰ منہاج النبوت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی۔ (مترجم)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت بہ حیثیت مجموعی ۔۔۔ انتظام اور قانون سازی دونوں کے اعتبار سے ۔۔۔ اکثر (خصوصاً اہم قومی ضرورت کے اوقات میں جب ہیئت حاکمہ کو تمام فیصلے جلد جلد کرنے پڑتے ہیں) دوائر و ظائف کی علیحدگی کے باعث شدید رکاوٹ محسوس کرتی ہے۔ یوں بہ ظاہر ان مملکتوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتی ہے جن میں مطلق العنان حکومتیں قائم ہیں[1] ہم جانتے ہیں کہ اسلام مطلق العنان حکومت کی مخالفت میں اتنا ہی سرگرم ہے' جتنی مغربی جمہوریتیں ہو سکتی ہیں' مگر اس معاملے میں بہت سے دوسرے معاملات کی طرح اسلام نے درمیانی طریقہ اختیار کیا' یعنی دونوں نظاموں کی مضرتوں سے پہلو بچایا اور دونوں کے فوائد ملت اسلامیہ کی خاطر محفوظ کر لیے۔ امیر کے ذریعے سے حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے پہلوؤں میں ارتباط پیدا کر کے ہم اقتدار کی اس دو گونگی پر نفع بخش قابو پا سکتے ہیں' جس کے باعث یورپ اور امریکہ میں ہیئت حاکمہ اور ہیئت قانون ساز کے درمیان اکثر اختلاف پیدا ہوتا رہا ہے اور بعض اوقات پارلیمانی حکومت گرانبار' بلکہ غیر مؤثر بن جاتی ہے۔ تاہم صلاحیت کار کا نفع (جو مطلق العنان حکومتوں کا نمایاں پہلو ہے) اسلامی مملکت میں حکومت کی کارروائیوں پر عوامی ضبط و نظم کا اصول کھو کر حاصل نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہیئت حاکمہ کی طرف سے مطلق العنانی کا ہر ممکن رجحان "امرھم شوری بینھم" کے ضابطے نے روک دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری کاروبار ہر پہلو' خواہ اس کا تعلق حاکمہ سے ہو یا مجلس قانون ساز سے' ملت کے مسلمہ نمائندوں کے درمیان مشورے کی بنا پر چلنا چاہیے۔

انحصار باہمی کے اس اصول کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے ذریعے سے جو فیصلے اکثریت کی بنا پر کیے جاتے ہیں' ان کی حیثیت محض مشورے کی نہیں ہوتی کہ حاکمہ کا جی چاہا تو قبول کر لیا' جی چاہا تو اختیار تمیزی کی بنا پر رد کر دیا۔ بلکہ وہ فیصلے قانونی اعتبار سے واجب العمل ہوتے ہیں۔

۱- مترجم کا یہ نوٹ اس غلط خیال پر مبنی ہے کہ خلافت حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ملوکیت میں بدل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت کا نظام مدتوں قائم رہا' اگرچہ اس نظام میں بہت سی کمزوریاں شامل ہو گئیں۔ یہ خلافت خلافت راشدہ نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ خلافت راشدہ مثالی لوگوں کے معاشرے میں قائم ہوئی تھی اور انہی لوگوں کے ہاں قائم ہو سکتی تھی۔ رہی خلافت تو وہ مدتوں قائم رہی اور آج بھی قائم ہو سکتی ہے کہ خلافت قانون سازی اور کارِ حکومت میں ہدایت الٰہی کی پابند ہے اور ملوکیت آزاد ہے۔ ہمارے خلفاء نے کبھی الٰہی احکام سے بغاوت نہیں کی' اس لیے انہیں بعض جزئی مماثلتوں کے باعث ملوک کہنا زیادتی ہے۔ (مدیر)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخی تجزیہ

ہم جانتے ہیں کہ چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں دور حاضر کے تصور کے مطابق کوئی قانون ساز مجلس موجود نہ تھی' تاہم یہ یقینی امر ہے کہ وہ عظیم المرتبت خلفاء پالیسی کے تمام بڑے مسائل میں ملت کے رؤساء سے مشورہ لیتے تھے۔ یقیناً یہ لوگ' جن سے مشورے لیے جاتے تھے' خاص اس غرض سے ملت نے منتخب نہیں کیے تھے' نیز خلفاء تمام معاملات میں ان کے مشورے کے پابند بھی نہ تھے۔ ہر خلیفہ مشورہ لیتا' اس کے مالہ وماعلیہ پر غور کرتا' پھر جو کچھ اپنے نزدیک حق سمجھتا' اس کے مطابق فیصلہ صادر کر دیتا۔ بعض اوقات اکثریت کی رائے قبول کی جاتی' بعض اوقات اقلیت کی' بعض اوقات دونوں کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس بنا پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر خلفائے راشدین' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب صحابیوں میں سے تھے' ایک باقاعدہ منتخب مجلس شوریٰ کو ضروری نہ سمجھتے رہے اور جو مشورہ دیا جاتا' اسے حرفاً حرفاً قبول نہ کرتے تھے تو آج یہ دعویٰ کیوں کر کیا جا سکتا ہے کہ:

الف۔ اسلامی مملکت کی مجلس شوریٰ کا انتخاب رائے عامہ کی بنا پر ہونا چاہیے۔

ب۔ اس مجلس میں جو قانون بنے' وہ بہرحال حاکمہ کے لیے واجب التعمیل ہونا چاہیے۔

ان میں سے پہلے سوال کا جواب نسبتہً سہل ہے۔ جب پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکرؓ کو قرآن کے اصول ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے مطابق ایک مجلس کی ضرورت پیش آئی' جو مملکت پر حکمرانی میں خلیفہ کو مدد دے تو حضرت ممدوح معاً اس ادارے کی طرف متوجہ ہوئے' جس پر زمانہ قدیم سے مہر تسلیم چلی آ رہی تھی اور شریعت نے بھی اسے منسوخ نہیں کیا تھا' یعنی قبائلی شیوخ اور خاندانی رؤسا کی مجلس۔ ان حالات میں خلیفہ کی رائے بلاشبہ درست تھی' کیونکہ قبائلی رشتے بالکل ختم نہیں ہوئے تھے' اگرچہ اسلام نے ان میں خاصی ڈھیل پیدا کر دی تھی۔ وقت کے عربی معاشرے نے بڑی حد تک قبائلی نظام باقی رکھا تھا' چنانچہ قبیلوں اور خاندانوں کے رئیس قانوناً نہیں تو عملاً اپنے گروہوں کی طرف سے بولنے اور عمل کرنے کے مختار تھے۔ اجتماعی معاملات میں جو رائیں قریش کے قبیلہ بنو زہرہ کے رئیس یا انصار کے قبیلہ اوس کے رئیس دیتے تھے' وہ ان قبیلوں اور خاندانوں کے دوسرے ارکان کی رایوں سے بالکل ہم آہنگ تھیں۔ اگر خلیفہ نظام [illegible] بت جاری کرتا تو اس صورت میں بھی یہی سردار منتخب ہوتے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان میں سے اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ قوم انھیں کو نمائندے نامزد کرتی' لہٰذا انتخاب کی ضرورت نہ تھی۔ خلیفہ ہر ضرورت کے وقت ان ممتاز صحابیوں اور قبائلی رئیسوں کو بلا لیتا اور یہی لوگ جماعت کے نمائندوں کی حیثیت میں مجلس شوریٰ کے ارکان تھے۔ انتخابات میں بھی یہی لوگ کامیاب ہوتے۔ چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں ملت اسلامیہ کے معاشرے کے اس انتظامی ڈھانچے میں عملاً کوئی تبدیلی نہ ہوئی' لہٰذا کسی کو مجلس شوریٰ کی ترکیب کے طریقے میں تبدیلی کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔

موجودہ اسلامی معاشرہ دوسرے مہذب ومتمدن معاشروں کی طرح قبائلی زندگی کے طور طریقوں سے مدت ہوئی' بہت آگے نکل چکا ہے اور اب قبائلی زندگی کی قیادت اپنی وہ اہمیت بھی کھو چکی ہے' جو پہلے اسے حاصل تھی' لہٰذا ہمارے پاس ملت کی رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے عوام کے ووٹ لیے بغیر کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ حد درجہ اہم معاملات میں ووٹ لینے کا مسئلہ استصواب رائے عامہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ وضع قانون کے عام معاملات میں انتخابات سے بہتر کوئی طریقہ اب تک کسی نے تجویز نہیں کیا۔ انتخابات سے مراد یہ ہے کہ ملت افراد کی ایک تعداد چن لے' جو نمائندگی کے فرائض انجام دیں۔ یہ ایسا بدیہی امر ہے کہ مجھے اس پر بحث کی ضرورت نہ تھی' مگر بہت سے مسلمان اب تک موجودہ معاشرے اور اسلام کے صدر اول کے معاشرے میں وضع وساخت کے اختلاف (جو بہت دور رس اختلاف تھا) کو سمجھ نہیں سکے۔ اگر خلفائے راشدین کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا' جو ہمیں پیش آئے تو یقیناً وہ ان سیاسی نتائج پر پہنچتے' جو تیرہ سو سال پیشتر کے نتائج سے بہت مختلف ہوتے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی مجلس شوریٰ رائے عامہ کی بنا پر منتخب ہوتی۔"(۱)

۱۔ سوال یہ ہے کہ معذرت کا پہلو اختیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہم کیوں نہ تسلیم کر لیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ پر خلافت کا بار آ پڑا تو کوئی انتخابی نظام موجود نہ تھا اور وہ جلد از جلد پیدا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ حضرت صدیق ؓ اور باقی خلفائے راشدین نے اصل مقاصد جمہوریت کو اس احسن طریق پر پورا کیا کہ آج چنے ہوئے صدر یا رؤسائے حکومت بھی ویسا عوامی نمونہ عمل پیش نہیں کر سکتے۔ کیا کوئی فرد اس حقیقت سے اختلاف کی جرأت کر سکتا ہے کہ خلفائے راشدین کے مشاہرے بہت کم تھے اور طریق بود وماند اس وقت کے ادنیٰ درجہ معیشت سے بلند نہ تھا؟ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت میں جو اخلاقی اور روحانی سربلندی حاصل ہوئی اور ان کے اندر جو احساس دیانت وذمہ داری نشوونما

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس امر کا اطلاق محض مجلس کے طریق وضع وساخت ہی پر نہیں ہوتا' بلکہ ان معاملات پر بھی ہوتا ہے' جن کے تحت یہ کام کرے گی' نیز یہ کہ دور حاضر کی اسلامی مملکت کے نظام میں اسے کیا حیثیت حاصل ہو گی۔ بہ طور خاص اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا مجلس شوریٰ یا قانون ساز مجلس کے فیصلے ہیئت حاکمہ کے لیے واجب التعمیل ہوں گے یا نہیں؟

تاریخی اعتبار سے یہ حقیقت مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا مملکت کے معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیا اور اس کے مطابق عمل فرما ہوئے۔ یہ قرآن کی ہدایت کا اتباع تھا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۱)

اور اس طرح کے معاملات میں (معاملات امن و جنگ میں) ان سے

پاچکا تھا' وہ ان کے بعد کہیں نہ ملا، حالانکہ بدرجہا بہتر زمانہ تھا' آج کہاں مل سکتا ہے؟ اگر انہیں مقاصد کی تکمیل کے لیے آج انتخابی طریق زیادہ اچھا اور انسب ہے تو اسے محض اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں یہ موجود نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں تو آج کی ہزاروں چیزیں موجود نہ تھیں۔ کتنے مسلمان فرمانروا ہیں' جنہوں نے ایک عمر بن عبدالعزیز کے سوا خلفائے راشدین کا سا طریق بود و ماند اختیار کیا؟ گنتی کے چند افراد پیش کیے جا سکتے ہیں' جنہوں نے اپنے گزارے کا بوجھ خزانہ عامرہ پر نہ ڈالا۔ کیا آج آپ ایسے افراد لا سکتے ہیں جو اسلام اور صرف اسلام کو اپنے لیے عزت کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ لباس سکونت یا سروسامان کے طمطراق کو ہیچ جانتے تھے۔

نیز حضرت صدیق ؓ اور حضرت فاروق ؓ نے جو تھوڑی سی رقم گزارے کے لیے وصول کی' وہ مرتے وقت بیت المال میں لوٹا دی۔ حضرت عثمان ؓ نے کوئی رقم نہ لی۔ حضرت علیؓ خود فرمایا کرتے تھے کہ خلیفہ کو بیت المال سے صرف دو پیمانے غلہ لینے کا حق حاصل ہے' ایک پیمانہ اپنے لیے اور ایک اہل وعیال کے لیے اور ایک مہمانوں کے لیے۔ جن خلفا کا احساس حقوق ومفاد عوام کے متعلق اتنا بلند تھا وہ غیر معمولی حالات میں بھی یہ حق بوجہ احسن پورا کر گئے۔ آج اس صورت حال کا تصور کون کر سکتا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے کہ ان خلفاء کے جو املاک اسلام سے پیشتر موجود تھے' وہ سب انہوں نے راہ اسلام میں قربان کر دیے تھے اور اپنے پیچھے کوئی چیز باقی نہ چھوڑی۔ ایسے آدمی آج کہاں ملیں گے؟

بہ طور خاص قابل توجہ امر یہ ہے کہ ملک کے انتظام میں عوام کو جو بنیادی حق حاصل ہے' اسے آج صحیح اور آزاد انتخاب کی بنا پر چنی ہوئی مجلس شوریٰ کے سوا پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے سوا جو کچھ کیا جائے گا وہ اس بنیادی حق کو خطرے میں ڈالنے کا موجب ہو گا۔ اگر تیرہ چودہ سو سال تک فرمانرواؤں کی خود غرضیوں اور حق ناشناسیوں کے باعث پامال رہنے کے بعد بھی مسلمانوں کو ہوش نہیں آیا اور اس نعمت کی وہ قدر نہیں کر سکتے جو اسلام نے انہیں دی تھی تو پھر اسے ان کی بدنصیبی کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے؟

۱۔ سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشورہ کرلیا کرو۔ پھر کسی بات کا عزم کرلو تو خدا پر بھروسا کرو (جو کچھ ٹھان لیا ہے' اس پر کاربند ہو جاؤ۔)

اس آیت کے منطوق سے بعض مسلمان علماء اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ قائد ملت مشورہ لینے پر مامور ہے' مگر اس پر عمل میں آزاد ہے' یعنی جو مناسب سمجھے' اس کے مطابق کاربند ہو جائے' لیکن اس نتیجے کی بے اساسی اسی وقت ظاہر ہو جاتی ہے' جب ہم سمجھ لیں[1] کہ یہ آیت

۱۔ سب سے پہلے یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے کہ جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی تھی' البتہ جانی نقصان بہت ہوا تھا۔ بعض اصحاب نے اسی نقصان کو شکست سے تعبیر کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جانی نقصان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو پکارا تو ایمان واخلاص کے پیکر ایک دم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے پلٹتے ہی دشمن میدان جنگ چھوڑ کر لوٹ گیا۔ اندیشہ تھا کہ یہ لوٹنا محض ایک جنگی چال نہ ہو اور مسلمان بہ اطمینان مدینہ منورہ جا بیٹھیں تو پھر اچانک حملہ کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے تعاقب کے لیے ارشاد فرمایا' تو فوراً ایک جماعت تیار ہوگئی جس میں زخمی بھی شریک تھے اور اس جماعت نے حمراء الاسد تک تعاقب کیا' جو مدینہ منورہ سے آٹھ میل پر ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ قریش کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تو یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچے۔

اس آیت کے سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ احد سے پیشتر نہیں' بلکہ بعد نازل ہوئی۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے مبارک کے خلاف اکثریت کی رائے پر عمل فرمایا۔ جنگ میں نقصان کا سبب یہ ہوا کہ تیر اندازوں کی جس جماعت کو "جبل عینین" (میدان احد کا ایک چھوٹا سا ٹیلا' جو جنگ احد کے بعد "جبل رمات" یعنی "تیر اندازوں کی پہاڑی" کے نام سے مشہور ہوا) پر بٹھایا گیا تھا اور تاکید کر دی گئی تھی کہ جنگ میں فتح بھی ہو جائے تو بھی وہ اس مقام سے نہ ہٹے' اس نے سامنے میدان میں مسلمانوں کو آگے بڑھتے اور قریش مکہ کو پسپا ہوتے دیکھ لیا تو مقام چھوڑ کر اس کے اکثر لوگ لڑائی میں شامل ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جماعت اس غرض سے وہاں بٹھائی تھی کہ میدان جنگ میں مسلمانوں کا عقب محفوظ رہے اور ادھر سے دشمن حملہ نہ کر سکے۔ اس جماعت کے سالار عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا' مگر جگہ چھوڑنے والے صاف دیکھ رہے تھے کہ مسلمان کامیاب ہو رہے ہیں' انہیں اپنے مقام کی اہمیت کا خیال نہ رہا۔ اس وقت تک خالدؓ بن ولید مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قریش مکہ کے رسالے کے سالار وہی تھے۔ انہوں نے قریش کے لشکر کو پسپا ہوتے دیکھا اور ادھر مسلمان تیر انداز مورچہ چھوڑ گئے تو جبل احد کا چکر کاٹ کر عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا' اسی میں جانی نقصان ہوا' جو تیر اندازوں کی لغزش کا نتیجہ تھا۔ اس آیت میں یہی فرمایا گیا ہے کہ بیشک تیر اندازوں سے لغزش ہوئی' آپ کی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ عفو ودرگزر سے کام لیں۔ اللہ کی رحمت نے آپ کے دل کو بے حد نرم اور مزاج کو سراسر شفیق بنایا ہے' اسی لیے لوگ بے اختیار آپ کی طرف کھچے چلے آتے ہیں' اگرچہ آپ کی رائے کے خلاف کھلے میدان میں مقابلے پر اصرار کر کے نوجوانوں نے جلد بازی سے کام لیا'

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر﴾

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ احد سے پیشتر نازل ہوئی تھی اور اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صائب تر رائے ملتوی فرما کر اکثریت صحابہؓ کی رائے ماننی پڑی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک یہ تھی ـ ـ ـ بعد کے واقعات نے اس کی اصابت پر مہر ثبت کر دی ـ ـ ـ کہ مسلمانوں کو کھلے میدان میں قریش مکہ کی فوج کا مقابلہ نہ کرنا چاہیے' جو تعداد میں زیادہ تھی' بلکہ استحکامات مدینہ کے اندر بیٹھ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ متعدد صحابیؓ اس رائے کے حامی تھے' لیکن بدر جہا زیادہ تعداد کا اصرار تھا کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادل ناخواستہ اکثریت کی رائے قبول کر لی۔

غرض رئیس یا امام یا خلیفہ کے لیے شرعاً واجب ہے کہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں پر کاربند ہو۔ اس کی مزید توثیق اس حدیث سے ہوتی ہے' جو زیر غور آیہ قرآن کے سلسلے میں چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لفظ "عزم" (ایک راہ عمل کا فیصلہ) کا مفہوم کیا ہے' جو اس آیت میں وارد ہوا ہے تو فرمایا:(۱)

مشاورۃ اهل الرائے ثم اتباعهم.

اہل الرائے سے مشورہ لینا' پھر اس پر کاربند ہونا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ عموماً اس مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتے تھے' جنہیں آج کل کی اصطلاح میں "مجلس خاص" کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا:(۲)

لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتکما.

﴿بقیہ حاشیہ﴾ مگر آپ کا طریق کار بہر حال یہی ہونا چاہیے کہ اہم معاملات خصوصاً صلح و جنگ کا فیصلہ مشورے کے بعد ہو۔ "وشاورهم فی الامر" سے پیشتر فرمایا گیا: "فاعف عنهم و استغفر لهم" (ان لوگوں کا قصور معاف کر دو اور اللہ سے بھی ان کے لیے بخشش طلب کرو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت کا محل جنگ سے پہلے نہیں' بلکہ جنگ کے بعد ہے۔

فاذا عزمت الی آخر کی تشریح یہ ہے کہ جماعت سے مشورہ کیا جائے۔ مشورے کے بعد کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس پر مضبوطی سے کاربند ہو جانا چاہیے۔ شوریٰ اپنے محل اور وقت میں ضروری ہے' عزم اپنے محل اور وقت میں۔ جب تک مشورہ ہے' عزم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جب مشورے کے بعد فیصلہ ہو گیا تو عزم کی منزل آ جاتی ہے۔ کوئی رائے' نکتہ چینی یا مخالفت اسے متزلزل نہیں کر سکتی۔ اگر فیصلے کے بعد بھی اس میں ردوبدل کی گنجائش رکھی جائے' خصوصاً معاملات جنگ میں تو عزم کی بنیادیں ہل جائیں گی حالانکہ عمل کا اصل انحصار عزم ہی پر ہے۔

۱ـ تفسیر ابن کثیر (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۳ھ) جلد دوم صفحہ ۷۷۔

۲ـ مسند امام احمد بن حنبل بروایت عبدالرحمٰن ابن غنم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم سے اختلاف نہ کروں گا۔

تاہم یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ خلفائے راشدین نے کیوں وقتاً فوقتاً "امرھم شوریٰ بینھم" کے اصول کی شدید پابندی سے اختلاف کیا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلامی دولت مشترکہ کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے (اور اس کے متعلق دوسرے باب میں اشارہ کیا جا چکا ہے) اور مملکت کے معاملات کا آخری فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دینا غیر ممکن ہوتا تھا' جو کتنے ہی نیک نیت اور دانشمند کیوں نہ ہوں' مگر وہ اسلامی مملکت کے تمام حالات سے ہر وقت آگاہ نہیں ہو سکتے تھے اور یہ مملکت مسلسل پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ مزید برآں خلفائے راشدین اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ عام مسلمانوں کا سیاسی شعور ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے اور ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ ممکن ہے سیاسی آراء و نظریات پر قبائلی مفاد کی مصلحتوں کا رنگ چڑھ جائے۔[1] لہٰذا انہوں نے مجلس شوریٰ قائم رکھی اور ضرورت کے موقع پر مشورے لیتے تھے

۱۔ یہ توجیہ بدلیلہ کمزور ہے۔ صحیح صورت وہی ہے جو ہم نے شروع ایک نوٹ میں واضح کر دی ہے یعنی انتخابی نظام موجود نہ تھا اور حالات ایسے تھے کہ اسے عاجلاً مکمل نہیں کیا جا سکتا تھا اور جب خلفا خود ہر پہلو کا انتظام احسن طریق پر کر رہے تھے اور عوام سے بھی بڑھ کر ان کے حقوق کے عملاً پاسدار تھے تو کسی کو اعتراض یا اختلاف کی ضرورت کیونکر پیش آ سکتی تھی۔

باقی رہا یہ امر کہ مسلمانوں کا سیاسی شعور ابتدائی حالت میں تھا تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کوئی فرد کسی فرد کے حلقہ بگوش اسلام ہو جانے کی بجائے خود اس امر کا ثبوت سمجھنا چاہیے کہ اس میں نیک و بد کے درمیان امتیاز پیدا ہو گیا تھا اور جو مسلمان زمانے کی تین نہایت متمدن طاقتوں ـــ ایران' مشرقی رومی سلطنت اور مصر ـــ کو بیک وقت چند سال میں شکست فاش دیتے' پھر ان کا انتظام بہترین طریق پر کرنے میں کامیاب ہو سکے' کیا ان کا سیاسی شعور ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ نہ تھا' جو تیرہ چودہ سو سال تک استبدادی حکومتوں کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے؟ یہ صحیح نہیں اور اسے درست مان لیا جائے تو آج بھی کوئی نہ کوئی خود غرض شخصیت ایسی پیدا ہو سکتی ہے' جو کہے کہ مسلمانوں کا شعور ابتدائی حالت میں ہے لہٰذا انتظامات میرے ہی قبضے میں رہنے چاہئیں۔ اگر شعور ابتدائی حالت میں بھی ہوتا تو خلفائے راشدین اپنے آغوش شفقت میں اس کی تربیت کا انتظام فرماتے۔ یہ نہیں کہ اسے ابتدائی حالت ہی میں چھوڑ دیتے اور خود اپنی مرضی سے حکومت کا کاروبار چلاتے رہتے۔ پھر ہر دور میں اس شعور ہی نہیں' بلکہ مظاہرہ حب حقوق کی مثالوں سے تاریخیں لبریز ہیں۔

ہمارے عہد میں جمہوریت مقبول ترین سیاسی نظام ہے۔ خلفائے راشدین کے نظام کو جمہوریت کے پیمانے سے ماپنے میں بہت قباحتیں ہیں۔ خلفائے راشدین کے مد نظر اسلام اور مسلمانوں کا مفاد تھا۔ اس سلسلے میں وہ مشورہ بھی کرتے تھے' کبھی شوریٰ کی بات مان لیتے اور کبھی اپنی بات منوا لیتے۔ ان کے اکثر فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے تھے نہ کہ کثرت رائے سے۔ انہوں نے آج کے معیار کے مطابق کوئی مستحکم ادارہ جیتا نہ بنایا نہ بنانے کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن وہ مشیروں کی رائے کے رد و قبول میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے' غالباً اس موقع پر ان کے لیے اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ نیز ممکن ہے' رئیس مملکت کی طرف سے فیصلوں میں یہ کھلی آزادی بھی تیزی سے خلافت کے انحطاط کے لیے ایک کار فرما عامل بن گئی ہو' کیونکہ اگرچہ اس آزادی سے حضرت عمرؓ جیسی حد درجہ قوی اور دور اندیش شخصیت کے زمانے میں نہایت شاندار نتائج پیدا ہوئے' مگر جب کسی کمزور حکمران سے رائے کی کوئی سخت لغزش سرزد ہوئی تو خود منصب خلافت کے احترام پر ضرب لگی۔ مثلاً اگر حضرت عثمانؓ مسلسل صحیح اصول پر قائم کردہ مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق کاربند رہتے تو پوری اسلامی تاریخ کی روہی مختلف نہ ہو جاتی؟

اس قیاسی سوال کا جواب کچھ بھی دیا جائے' لیکن ہم یہ توقع رکھنے میں یقیناً حق بجانب نہ ہوں گے کہ ہر امیر حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کے جوہر ذکاوت اور قوت عزم سے بہرہ مند ہوگا۔ اس کے برعکس پوری تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی شخصیتیں حد درجہ مستثنیٰ حیثیت رکھتی ہیں اور بہت کم وجود میں آتی ہیں۔ ارباب نظم کی اکثریت ہمیشہ تمام معاشروں میں ایسی ہی ہوتی ہے کہ اگر انہیں ان کے غور و تدبر پر چھوڑ دیا جائے تو بعض اوقات ان سے شدید غلطیاں سرزد ہوتی ہیں' لہٰذا انہیں ان کے غور و تدبر پر نہ چھوڑنا چاہیے اور ضروری ہے کہ وہ پوری ملت کے مسلمہ نمائندوں کے مشورے سے حکومت کا کاروبار چلائیں۔ تاریخ کا یہ ایک ایسا پختہ سبق ہے' جس سے کوئی قوم اپنے لیے خطرہ قبول کیے بغیر تغافل نہیں کر سکتی۔

اختیارات حاکمیت

یوں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی مملکت کا کاروبار مشاورت کی بناء پر انجام پانا چاہیے' یعنی قانون ساز ہیئت اور ہیئت حاکمہ میں گہرا ربط ضبط ضروری ہے (دونوں کی قیادت کا منصب ایک شخصیت میں جمع ہوگا' یعنی امیر میں) لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت کی ان دو شاخوں

﴿بقیہ حاشیہ﴾ ضرورت محسوس کی۔ اصل سبب یہ ہے کہ مدینے کا معاشرہ تربیت یافتہ معاشرہ تھا۔ یہی معاشرہ سیاسی امور میں رائے دہی کا اہل سمجھا گیا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کو نہ رائے دینے کا اہل ٹھہرایا گیا، نہ سیاسی امور میں اُن کی رائے حاصل کرنا ضروری تھا۔ خلفائے راشدین کی شوریٰ بہترین لوگوں پر مشتمل تھی۔ اسی لیے یہ لوگ منتخب تھے۔ صحابہ اللہ کے دین سے راضی تھے اور اللہ ان سے راضی تھا۔ صحابہ کے سیاسی نظام کے بارے میں کسی معذرت خواہی کی ضرورت نہیں۔ آج کی صورت حال میں دین کا فہم رکھنے والوں اور دین پر عمل کرنے والوں کی رائے کو خصوصی حیثیت یقیناً دی جائے گی، خصوصاً اُن امور میں جن کا تعلق مسائل شرعیہ سے ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے درمیان رسمی ربط ضبط کی صورت کیا ہوگی؟ ہمارے سامنے "امرھم شوریٰ بینھم" کا اصول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کاروبار حکومت مشورے کی بنا پر انجام پانا چاہیے، مگر کیا اس اصول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہیئت حاکمہ کو عام نظم ونسق کی ہر تفصیل مجلس قانون ساز کے روبرو پیش کر کے منظوری لینی چاہیے؟ اگر ایسا ہوتا تو حکومت کی کوئی مشینری صلاحیت سے کام نہ کر سکتی۔ شریعت ایسی صورت حالات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا اس مشکل کے حل کے لیے بھی ہمیں شریعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور خود قرآن مجید نے اس کا جواب مہیا کر دیا ہے۔

ہم قرآن مجید کی اس آیت پر غور کر چکے ہیں!

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ.(۱)

نیز اس طرح کے معاملات میں (معاملات جنگ وصلح) ان سے مشورہ کر لیا کرو، پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا تو چاہیے کہ خدا پر بھروسا کرو (جو کچھ ٹھان لیا ہے اس پر کاربند ہو جاؤ)

اس آیت سے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ امیر کے لیے مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو قبول کرنا واجب ہے، لیکن یہ الفاظ: "اور جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا تو چاہیے کہ خدا پر بھروسا کرو" ہمیں ایک اور نتیجے پر پہنچاتے ہیں۔ جب قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے توکل (خدا پر بھروسا کرنا) کے الفاظ صادر ہوتے ہیں تو ان اعمال کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جن کے لیے نصوص میں کوئی واضح ہدایت موجود نہیں۔ اسی لیے یہ معاملہ انفرادی رائے پر چھوڑا جاتا ہے، جس طرح مناسب سمجھا جائے، عمل کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں متعلقہ شخص کو ایک حد تک کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ضمیر کے تقاضوں کے مطابق جو طریقہ مناسب سمجھے، اختیار کر لے۔ جو مسئلہ ہمارے زیر بحث ہے، اس کے تعلق میں اس شق کی صورت یہ بنتی ہے "اگرچہ امیر مجلس شوریٰ کے بنائے ہوئے تمام قوانین کا پابند ہے اور پالیسی کے بڑے معاملات میں اسے مجلس ہی کے فیصلے پیش نظر رکھنے چاہئیں، لیکن ان فیصلوں کو معرض عمل میں لانے کے طریق اور عام نظم ونسق کے سلسلے میں ہدایات کا اجرا اس ہیئت حاکمہ کی مصلحت شناسی پر چھوڑ دیا گیا ہے، جس کا وہ صدر ہے۔ اگرچہ مجلس کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ اہم امور کے متعلق فیصلے کرے، جن پر عمل ہونا چاہیے اور قانون بنائے جن کی بنا پر ملک کی

۱۔ سورہ آل عمران آیت ۱۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کا کاروبار جاری رہے۔ عمومی حیثیت میں مجلس شوریٰ حکومت کی سرگرمیوں پر نگرانی کا فرض بھی انجام دے سکتی ہے مگر اسے یہ حق حاصل نہیں کہ ہیئت حاکمہ کے عام کاروبار میں مداخلت کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امیر کو حاکمیت کے پورے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ اگر رئیس مملکت کے منصب کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا جائے اور وہ محض برائے نام امیر رہ جائے۔۔۔ جیسا مثلاً دیگول سے پیشتر فرانس کا صدر تھا یا ملکہ انگلستان ہے۔۔۔ تو ظاہر ہے کہ قرآنی نقطہء نگاہ سے یہ محض ایک فضول منصب رہ جائے گا' حالانکہ قرآن نے مسلمانوں کو اصحاب امر و حکم کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اسے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ضمیمہ بنایا ہے۔

حکومت کا ڈھانچا

غرض اگر تمام حاکمانہ اختیارات امیر کو دے دیے جائیں تو یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا یہ اختیارات۔۔۔ اور ان سے پیدا ہونے والے وظائف۔۔۔ صرف اسی کے حوالے ہوں (جیسا مثلاً امریکا میں صدر کے حوالے ہوتے ہیں) یا ان اختیارات کو وہ بہ اشتراک استعمال کرے گا مثلاً کابینہء وزراء اس میں شریک ہو گی' کیونکہ وہ مجلس شوریٰ کی بڑی پارٹیوں کی نمائندہ ہو گی اور دوران وزارت میں وہ مجلس شوریٰ ہی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر سکے گی۔ ان دونوں صورتوں کے لیے کوئی واضح شرعی قانون موجود نہیں' تاہم بہت سی صحیح احادیث کے منطوق سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخصیت میں تمام حاکمانہ اختیارات مرتکز رکھنے کو اسلامی نظام سیاست کے مقاصد کے لیے زیادہ موزوں تصور فرماتے تھے' اسے امیر یا امام کہا گیا ہے۔ یہاں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی وانما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ۔(۱)

جس نے میری اطاعت کی' اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی' اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی' اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی

۱۔ بخاری و مسلم بہ روایت ابو ہریرہؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی۔ امیر ایک ڈھال ہے جس کی حفاظت میں لوگ لڑتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

۲. الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیته.(۱)

دیکھو! تم میں سے ہر ایک گلہ بان ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے کے متعلق پوچھا جائے گا۔ جو شخص لوگوں پر امام مقرر ہوا ہے وہ بھی گلہ بان ہے اور اپنے گلے کے لیے جواب دہ ہے۔

۳. من بایع اماماً واعطاہ صفقة یدہ وثمرة قلبه فلیطعه ان استطاع فان جاء آخر ینازعه فاضربوا عنق الآخر.(۲)

جس نے امام کی بیعت کی' اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا' دل کا ثمر اس کے حوالے کیا۔ ضروری ہے کہ جس حد تک استطاعت ہے (جب تک کہ گناہ کا ارتکاب لازم نہ آ جائے) اس کی اطاعت کرے اور اگر کوئی دوسرا آدمی حق امامت چھیننے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اور ایسے ہی دوسرے ارشادات حضورؐ کے اس حکم عام کے عین مطابق ہیں کہ مسلمان کسی اہم مشترکہ کام میں مصروف ہوں تو ایک آدمی کو دوسرے کی امارت وقیادت کے لیے چن لینا چاہیے(۳)۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ یورپی نمونے کی پارلیمانی حکومت ـــ یعنی کابینہ وزراء' جس کے تمام اختیارات براہ راست قانون ساز مجلس سے لیے جائیں اور اسی کے روبرو وہ براہ راست جواب دہ ہو ـــ لازماً ایک آدمی کی قیادت وامارت کے خلاف نہیں جاتی' کیونکہ اسلامی مملکت میں امیر کابینہ وزارت کا رئیس ہو گا اور ہم جانتے ہیں کہ رئیس مملکت اور وزیر اعظم کے دوگونہ وظیفے اس کی ذات میں جمع ہو جائیں گے' لیکن عقل سلیم ہمیں بتاتی ہے کہ ایسا انتظام امیر کی حیثیت کو حد درجہ بے ربط بنا دے گا۔ ایک طرف وہ منتخب حاکم بن جائے گا خود ذوالامر یعنی صاحب اقتدار ہو گا' کیونکہ اسے رائے عامہ سے چنا

۱- ایضاً بروایت عبداللہؓ بن عمرؓ۔

۲- مسلم بروایت عبداللہؓ بن عمروؓ۔

۳- اس مضمون کی زیادہ ترکی احادیث قاضی محمد بن علی الشوکانی (وفات ۱۲۵۵ھ۔ ۱۸۳۹ء) نے اپنی بہ مثال کتاب "نیل الاوطار" (مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ) میں درج کر کے ان کی تشریح کر دی ہے۔ دیکھئے جلد ۹ صفحہ ۱۵۷-۱۵۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے گا۔ دوسری طرف اسے ان وزراء کو ہیئت حاکمہ کی ذمہ داریوں میں شریک کرنا پڑے گا' جو قانون ساز مجلس کے روبرو فرداً فرداً جوابدہ ہوں گے۔ یوں مجلس شوریٰ کی پارٹیاں مملکت میں اختیارات حاکمہ کا سرچشمہ بن جائیں گی۔ امیر کو یہ حیثیت حاصل نہ رہے گی۔ یہ انتظام اسلامی تصور قیادت کے بھی خلاف ہے اور حکومت کی پالیسی بھی لامحالہ مفاہمت یا لامتناہی سلسلہ ہائے مفاہمت پر موقوف رہ جائے گی۔ یہ مفاہمتیں مختلف اور بعض اوقات متصادم پارٹیوں کے پروگراموں میں قبول کرنی پڑیں گی۔ اس طرح وہ یکسوئی' یک آہنگی اور داخلی تواتر پیدا نہ ہوگا' جو اسلامی مملکت کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔

مخالف پارٹیوں کے پروگرام کے درمیان مفاہمت کا یہ اصول ممکن ہے' بہت ضروری ہو۔۔۔ بعض اوقات اخلاقی اعتبار سے حق بجانب بھی ہو جاتا ہے۔۔۔ خصوصاً ان گروہوں میں' جو کسی قطعی نظریے کی روح سے معمور نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے تمام سیاسی فیصلے لوگوں کے بدلتے ہوئے نظریات کے تابع رکھتے ہیں اور یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ خاص حالات میں صحیح راہ عمل کیا ہوسکتی ہے' لیکن نظریاتی اسلامی مملکت میں ایسی صورت حال پیش ہی نہیں آ سکتی۔ وہاں نیک و بد اور حق و باطل کے تصورات مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں وقتی مصلحتوں پر منحصر نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسی مملکت میں صرف قانون ہی نہیں' بلکہ انتظامی پالیسی میں بھی وہ نظریاتی حیثیت ہر وقت واضح رہنی چاہیے' جس پر ملت کا اتفاق ہو چکا ہے اور اگر حکومت کو عام کاروبار سیاسیات احزابیہ کے تابع رکھنا پڑے تو ایسا ہونا (نظریے کا قانونی اور انتظامی معاملات میں اظہار) ممکن ہی نہیں[1]۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹیوں کا وجود خارج از بحث ہے۔ اگر نقد و نظر اور رائے کی آزادی کا حق ہر شہری کا طبعی حق تسلیم کیا جاتا ہے (اور اسلام کا سیاسی تصور بے شائبہ ریب یہی ہے) تو لوگوں کو گروہ بندی کی آزادی حاصل رہنی چاہیے' اگر وہ چاہیں تو کسی مسئلے کے متعلق خاص آراء کے اظہار کی اشاعت کرسکیں' جن پر مملکت کی پالیسی مبنی ہونی چاہیے' لیکن یہ ضروری ہے کہ آراء اس نظریے کے خلاف نہ ہوں' جس پر مملکت کی بنا رکھی گئی ہے' یعنی شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ ان پارٹیوں کو مجلس شوریٰ کے اندر اور

۱۔ کیوں ممکن نہیں؟ جب شوریٰ میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی تو پارٹیوں میں اکثریت انہیں کی ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک پارٹی کا پروگرام تو اسلامی ریاست پر مبنی ہو اور دوسری کا نہ ہو۔ اگر کسی کے پروگرام میں کوئی چیز غیر اسلامی ہو تو اسے یاد دلا دینا بالکل کافی ہوگا' کیوں کہ کوئی مسلمان دانستہ کسی ایسے امر پر اصرار نہیں کرسکتا' جو واضح طور پر غیر اسلامی ہو۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باہر اپنے آراء کے پیش کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے، تاہم پارٹیاں بنانے اور پروگراموں کی اشاعت کرنے کی آزادی کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ حکومت کے انتظامی کاروبار پر اثر پڑے۔ اگر حکومت ایسے وزراء سے مرکب ہوگی' جو اپنی پارٹیوں کے حکم کے تابع رہ کر کام کریں اور انہیں کے روبرو جواب دہ ہوں تو یقیناً حکومت کے عملی کاروبار پر اثر پڑے گا۔ (۱)

ان حالات کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ صرف امیر ہی ایسی شخصیت ہے' جسے انتظامی اختیارات و وظائف سونپے جانے چاہئیں اور وہی مجلس کے روبرو۔۔۔ اور مجلس کے ذریعے سے عوام کے روبرو۔۔۔ کاروبار حکومت کے لیے جواب دہ ہوگا۔ وزراء کو صرف اس کے انتظامی مددگاروں یا سکرٹریوں کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ وہی اپنی صواب دید کی بنا پر انہیں مقرر کرے اور وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ وزیر' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات حکومت کے سلسلے میں استعمال فرمایا، ایک ایسے شخص کے لیے تھا جو رئیس مملکت کو حکومت کا بوجھ برداشت کرنے میں امداد دے یعنی وہ انتظامی مددگار کے لیے استعمال ہوا تھا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اذا اراد الله بالامير خيراً جعل له وزير صدق ان نسی ذكره وان ذكر اعانه واذا اراد به غير ذلك جعل له وزير سوء ان نسی لم يذكره وان ذكر لم يعنه. (۲)
>
> جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ایک قابل اعتماد وزیر دے دیتا ہے۔ جب امیر کوئی بات بھول جاتا ہے تو وہ یاد دلا دیتا ہے اور جب امیر کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو وزیر اس میں معاون ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کسی امیر کے متعلق خدا کا ارادہ خیر کا نہیں ہوتا تو اس کے لیے برا مددگار مہیا کر دیتا ہے جو نہ بھولی ہوئی چیز یاد دلاتا ہے اور نہ ذکر کردہ کام میں مدد کرتا ہے۔

۱- یہ نکتہ سمجھ میں نہ آیا کہ مجلس کے روبرو امیر کی ذمہ داری تو ٹھیک ہے' مگر وزراء کی انفرادی یا مشترک ذمہ داری انتظامی امور پر اثر انداز ہوگی۔ پارٹیوں میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وزراء کو ذمہ دار بنا دینے سے انتظام ضرور خراب ہو جائے گا۔ تنہا امیر کے بجائے پانچ یا دس وزراء کی ذمہ داری میں خرابی کے مواقع نسبتاً کم ہونے چاہئیں نہ کہ زیادہ۔

۲- ابوداؤد و نسائی بہ روایت حضرت عائشہؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر مسلمان اپنی مملکت یا مملکتوں کے لیے ایک آدمی کا طریق حکومت اختیار کریں تو وہ بالواسطہ اس اصول کے پابند ہو جائیں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو سال پیشتر تجویز فرمایا تھا[1] آخری فیصلہ کرتے وقت محض یہی امر ان کے نزدیک خاصا وزنی ہونا چاہیے' لیکن ایک آدمی کے نظام کے حق میں ایک اور دلیل بھی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اولوالامر (ارباب اختیار) اسلامی مملکت میں صرف مسلمان ہونے چاہیں۔ اگر حکومت کے انتظامی اختیارات وزراء کو سونپے جائیں' جو مجلس شوریٰ میں سے احزابی نمائندگی کی بنا پر چنے جائیں گے۔۔۔ جیسا کہ مغربی یورپ کی پارلیمانی جمہوریتوں میں مروج ہے۔۔۔ تو یہ وزراء امیر کے ساتھ مل کر انتظامی اعتبار سے اولوالامر بنیں گے اور ان کے پاس مجلس کی دستاویز ہوگی۔ گویا کسی غیر مسلم کو وزیر بنانے کی صورت میں شریعت کی اس دفعہ سے صریح اختلاف ہوگا' جس کے مطابق مملکت کی انتظامی قیادت صرف مسلمانوں کے لیے محفوظ رکھی گئی' لہٰذا ملت کو یہ مشکل پیش آجائے گی کہ یا تو حکماً غیر مسلم شہریوں کے لیے وزارتی عہدے ممنوع قرار دے (اس وجہ سے غیر مسلم اقلیتوں کے لیے معاملات مملکت میں وفادارانہ تعاون مشکل ہو جائے گا) یا شریعت کے اس بنیادی حکم کو پس پشت ڈال دیا جائے (جس سے مملکت کے اسلامی تصور کی جڑ پر ضرب لگے گی) لیکن اگر تمام انتظامی اختیارات اور حقوق صرف امیر کے حوالے ہوں تو بظاہر وہی تنہا صاحب امر ہوگا اور اپنی حکومت کی ہر سرگرمیوں کے لیے ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ وزیر محض اس کے سیکرٹری یا انتظامی معاون ہوں گے۔ وہ اپنی مرضی سے انہیں مقرر کرے گا اور ہر ایک کو وہ اختیارات سونپے گا' جو اس کے منصب میں مضمر ہیں۔ چونکہ

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نظر حالات وانتظامات کے سلسلے میں جو ارشادات فرمائے' ان کے متعلق غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ حضور مختلف کاموں کے لیے امیر مقرر فرماتے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ "امرھم شوریٰ بینھم" کے مقاصد بہ وجہ احسن پورے ہوں۔ تیرہ سو سال پیشتر ایک خاص صورت رائج تھی۔ اگر اب اس سے محفوظ تر صورت سامنے آگئی ہے اور "شاورھم فی الامر" کا مقصد خطرات سے بچتے ہوئے اسی طرح پورا ہوتا ہے تو اسے اختیارات کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کی پیشانی کو بابرکت قرار دیا۔ مقصد یہ تھا کہ دفاعی معاملات میں گھوڑے کو اس وقت خاص اہمیت حاصل تھی۔ اب گھوڑے کی جگہ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں نے لے لی ہے۔ کل ان سے بھی موثر تر کوئی چیز رواج پا سکتی ہے۔ ہم حضور کے ارشاد کا مطلب یہی سمجھیں گے کہ دفاع کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وقت کا جو وسیلہ اس کے لیے زیادہ مفید وسازگار نظر آئے' اس سے کام لینا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وزیر یا سیکریٹری پالیسی وضع کرنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے لہٰذا انہیں بجائے خود اولوالامر نہیں مانا جائے گا۔ اس صورت میں کسی غیر مسلم کو وزارت کا عہدہ دے دینا بھی شرعاً قابل اعتراض نہ ہوگا۔ اس طرح غیر مسلم شہریوں کے تعلق میں ناواجب امتیاز کی نوبت نہ آئے گی اور حکومت کے لیے ملک کی بہترین صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو جائے گا۔

مقننہ اور حاکمہ میں ارتباط

ساتھ ہی ہمیں قرآن کے اس حکم "امرھم شوریٰ بینھم" کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے اور ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس آیت کے مطابق حکومت کے تمام بڑے بڑے معاملات براہ راست مشورے پر موقوف رہنے چاہئیں۔ جس حد تک نظریے کا تعلق ہے' اس تقاضے کو شوریٰ کا ادارہ پورا کر دیتا ہے' جو پالیسی کے تمام اہم معاملات پر اپنا فیصلہ صادر کرے گی' نیز ملک کے لیے وہ قوانین بنائے گی' جن کے مطابق کاروبار حکومت جاری رہے گا' لیکن عملاً معاملہ اتنا سادہ اور سہل نہیں۔

سیاسیات کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ قانون ساز مجلس نہیں' بلکہ ہیئت حاکمہ کی مختلف شاخیں دور حاضر کی مملکت میں قانون "بناتی ہیں"۔ اگرچہ یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی۔ موجودہ دور میں قانون سازی کا اہم مسئلہ ماہرین کی جانب سے تیاری اور چھان بین کا متقاضی ہے۔ قانون ترتیب دینے اور منظور کرانے میں خاصی قانونی صلاحیت مطلوب ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فنی معلومات کی ایسی فراہمی اور فنی صلاحیت کی توقع اس مجمع افراد سے نہیں رکھی جا سکتی' جو رائے عامہ سے منتخب ہو' کیوں کہ عام لوگ امیدواروں کی صرف عمرانی دیانت اور علم ونظر کی شہرت سے آگاہ ہوتے ہیں اور وہ قانون سازی کی فنی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ علاوہ بریں آج کل کی پارلیمنٹیں ارکان کی زیادہ تعداد پر مشتمل ہوتی ہیں اور کسی کے لیے قانون کا مطالعہ کرنا اور اسے ترتیب دینا حد درجہ مشکل ہوتا ہے' اس لیے چھان بین' تیاری اور ترتیب سے متعلقہ کام۔۔۔ بلکہ قانون کو مجلس شوریٰ میں پیش کرنے کا بھی کام ۔۔۔ دور حاضر کی مملکتوں میں ہیئت حاکمہ کی ذمہ داری بن جاتا ہے۔ حکومت کی ہیئت حاکمہ ہی زیادہ تر بڑے بڑے مسودات قانون تیار کراتی ہے۔ اس کے انتظامی عملے کے خاص آدمی فنی اعتبار سے انہیں ترتیب دیتے ہیں' جنہیں خاص اسی غرض سے تربیت دی جاتی ہے۔ پھر یہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون ساز مجلس کے سامنے بحث' مناسب ترمیمات اور آخری فیصلے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

اس قسم کا طریق عمل اسلامی نقطہء نگاہ سے بالکل اطمینان بخش ہے' کیونکہ اس سے مشورہء عام کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی ضابطہ اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا' جب تک مجلس شوریٰ بحث و تمحیص کے بعد ترمیمات کے ساتھ یا ان کے بغیر اس پر مہر توثیق ثبت نہ کر دے' لیکن قانون کے متعلق اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کے نقطہء نگاہ سے محض مشورہء عام کافی نہیں۔ ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے اصول کا مقتضا یہ ہے کہ حکومت کی تمام سرگرمیاں (خواہ ان کا تعلق قانون سازی سے ہو یا اختیارات حاکمہ سے) براہ راست مشورے ہی کے تابع رہنی چاہئیں۔ یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا' جب تک حکومت کی ہیئت حاکمہ کے کام میں قدم قدم پر رکاوٹ پیدا نہ کی جائے اور اس طرح اس کی آزادی عملاً تباہ نہ کر دی جائے۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا صرف ایک حل ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دور حاضر کی پارلیمنٹوں میں حکومت کے خاص معاملات سے عہدہ برا ہونے کے لیے خاص کمیٹیاں بنا دی جاتی ہیں' مثلاً امور خارجہ کی کمیٹی' قومی دفاع کی کمیٹی' عدالتی کمیٹی وغیرہ۔ یہ کمیٹیاں قانون ساز مجلس یا مجلس شوریٰ کے ارکان منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے میں سے کچھ ارکان چن لیتے ہیں' انہیں کے سامنے ہیئت حاکمہ وقتاً فوقتاً اپنی پالیسی کی توضیح کرتی رہتی ہے اور انہیں سے اپنے انتظامی کاروبار کے طور طریقوں کے لیے ابتدائی منظوری لیتی ہے۔ اس طریقہ عمل کے مطابق پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس کی بحث میں سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔ تاہم سمجھ لینا چاہیے کہ کسی پارلیمانی کمیٹی کی منظوری اور نامنظوری ۔۔۔ اور بعد میں پوری پارلیمنٹ کی منظوری و نامنظوری ۔۔۔ عموماً حکومت کی حاکمانہ پالیسی کے متعلق ایک ایسا حکم ہوتی ہے' جو بعد از وقت صادر ہوتا ہے' یعنی بہ حیثیت مجلس (یا اس کی کوئی پارلیمانی کمیٹی) صرف مستثنیٰ مواقع پر ہیئت حاکمہ کی عام پالیسی سے وابستہ ہوتی ہے اور وہ بھی صرف اس طریق پر جو ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے عین مطابق ہو۔ ابتدا میں ایسی صورت ہرگز پیش نہیں آتی۔ ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے مطابق اسلامی مجلس شوریٰ کی پارلیمانی کمیٹیوں کو ہیئت حاکمہ اور حکومت کی قانون ساز سرگرمیوں کے ساتھ پوری طرح مرتبط کر دینا چاہیے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی یہ صورتیں ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الف۔ ہر پارلیمانی کمیٹی کے اراکین کی تعداد بہت کم رکھی جائے۔

(ب) ہر کمیٹی کو متعلقہ وزیر کے ساتھ مجلس شوریٰ کی حیثیت میں کام کرنا چاہیے۔

اس طریق پر تمام انتظامی معاملات اور تمام قوانین عوام کے منتخب نمائندوں کے مشورے سے طے ہو سکتے ہیں۔ یہ کام ابتدا سے انتہا تک جاری رکھا جا سکتا ہے اور حکومت کی صلاحیت کار پر کوئی برا اثر نہ پڑے گا۔

مقننہ اور حاکمہ میں محاکمہ

اب صرف ایک اہم مسئلہ رہ گیا اور وہ یہ کہ اگر مجلس شوریٰ اور حاکمہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو کیا کیا جائے؟ بعض اوقات ایسی صورت پیش آ سکتی ہے کہ حاکمہ کے کام کے ساتھ پارلیمانی کمیٹیوں کی گہری وابستگی کے باوجود مجلس شوریٰ مناسب سمجھتی ہے، حکومت کی کسی پالیسی یا انتظامی تدبیر کے خلاف اعتراض کرے، کیوں کہ مجلس کی اکثریت حکومت کی اس پالیسی یا انتظامی تدبیر کو مروجہ قوانین سے متناقض قرار دیتی ہے یا مجلس شوریٰ کی اکثریت جس امر کو سلطنت کا بہترین مفاد تصور کرتی ہے، حکومت کی پالیسی یا انتظامی تدبیر سے اس پر زد پڑتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ امیر کسی وقت ایسے ہی وجوہ کی بنا پر مجلس شوریٰ کے کسی فیصلے کو از روئے ضمیر قابل اعتراض سمجھے۔ اس سے جو اختلاف رائے رونما ہو گا، وہ ایسے تعطل پر منتج ہو سکتا ہے اور یورپ کی پارلیمانی جمہوریتوں میں ایسے مواقع پر جو ذریعے عموماً استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہمارے ہاں ایسے مواقع پر کارگر نہیں ہو سکتے۔ یورپی جمہوریتوں میں یا تو وزارت مستعفی ہو جاتی ہے یا پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک اسلامی مملکت کی حاکمہ کے رئیس ـــ یعنی امیر ـــ کو پوری ملت منتخب کرتی ہے اور (نفس انتخاب کے ذریعے سے) امیر کے روبرو ''سمع و طاعت'' کا حلف اٹھا لیتی ہے۔ یہ حلف اس وقت تک قائم رہے گا جب تک امیر قانون اسلام کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ امیر کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کو نظر انداز کر دے یا ان کے خلاف حکم دے دے۔ خود مجلس شوریٰ بھی مغربی جمہوریتوں کی مقتدر قانون ساز مجلسوں کی طرح اس حکومت پر اعتماد سے دست کش نہیں ہو سکتی جو کسی خاص معاملے میں اس کے فیصلوں سے متفق نہ ہو۔ ساتھ ہی واضح نصی حکم اسلام کے اخلاقی اقدار بھی بحال رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ فرداً فرداً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارکان مجلس بھی امیر کے لیے وہی حلف اطاعت اٹھا چکے ہیں جس سے پوری ملت وابستہ ہے۔ یوں تعطل بظاہر نا قابل حل ہو جاتا ہے (۱)' مگر صرف بظاہر کیوں کہ قرآن نے اس ضابطے سے باہر نکلنے کا راستہ بتا دیا ہے۔ ہم اس کتاب کے تیسرے باب میں اس قرآنی فرمان پر گفتگو کر چکے ہیں۔

أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو' اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں امر اور اختیار رکھتے ہیں۔

لیکن یہ آیت کا پہلا حصہ تھا' اس کا دوسرا حصہ یوں ہے!

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (۲)

اگر ایسا ہو کہ کسی معاملے میں باہم جھگڑ پڑو۔ (اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو (اور جو فیصلہ وہاں سے ملے اسے تسلیم کرلو)

ظاہر ہے کہ جب مجلس شوریٰ اور ''تم میں سے ارباب حکم و اختیار'' (یعنی امیر) کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں فریقوں کو زیر بحث نکتے کے فیصلے کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے یا واضح تر لفظوں میں یہ معاملہ ثالثوں کی ایک جماعت کے حوالے کر دیا جائے' جو اصل معاملے پر غیر جانبدارانہ حیثیت میں غور و فکر کرے اور بتا دے کہ متصادم نظریوں میں سے کون سا نظریہ روح قرآن و سنت سے قریب تر ہے، لہٰذا ثالثی کی ایک غیر جانبدار مشینری کی ضرورت بالکل واضح ہو جاتی ہے' یعنی ایک ایسا اعلیٰ ٹربیونل' جس کا تعلق صرف دستوری معاملات سے ہو۔ اس ٹربیونل کا حق اور فرض یہ ہوگا:

الف۔ امیر اور مجلس شوریٰ کے درمیان جو اختلافی معاملات کسی ایک یا دونوں فریقوں کی طرف سے پیش ہوں ان کا فیصلہ ثالثی کے طریق پر کر دے۔

ب۔ بہ طور خود مجلس شوریٰ کے کسی منظور کردہ قانون یا امیر کی طرف سے کسی انتظامی فعل کو ویٹو

۱۔ ظاہر ہے کہ یہ تعطل فاضل مصنف کی اپنی تجویز سے پیدا ہوا۔ اگر مجلس شوریٰ تمام معاملات کی مختار ہو نہ کہ امیر تو تعطل پیدا نہیں ہو سکتا' البتہ جس ٹربیونل کی تجویز فاضل مصنف نے آگے چل کر پیش کی ہے وہ بہر حال ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ سورہ نساء آیت ۵۹۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے روک دے جو اس کی (ٹربیونل کی) رائے میں نصوص قرآن و سنت سے متناقض ہو۔
غرض ٹربیونل دستور کے محافظ کا فرض انجام دے گا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ایسے ٹربیونل میں وہ لوگ شامل کیے جائیں' جو پوری ملت میں بہترین فقیہ ہوں' جنہیں نہ صرف قرآن و حدیث پر عبور ہو' بلکہ دنیا کے معاملات سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں' کیونکہ ایسے ہی افراد زیادہ یقین کی بنا پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مجلس شوریٰ کا کوئی قانون درست ہے یا نادرست اور امیر کا کوئی انتظامی عمل روح اسلام کے مطابق ہے یا نا مطابق۔

اس اعلیٰ ٹربیونل کی ترکیب و ترتیب کے لیے یا تو یہ صورت ہے کہ مجلس کے ارکان شرعی حیثیت میں مشورے کے بعد ناموں کی ایک فہرست امیر کے روبرو پیش کر دیں یا یہ کہ امیر ایسے ناموں کی فہرست تیار کر کے مجلس کے روبرو پیش کر دے اور مجلس اس فہرست میں سے مطلوبہ تعداد افراد منتخب کر لے۔ میرے نزدیک ایسے افراد کا تقرر تاحیات ہونا چاہیے۔ اگر کسی رکن کی میعاد منصب خاص عمر تک مقرر کر دی جائے تو بعد میں بھی اسے یہ اعزاز حاصل رہنا چاہیے' گویا وہ زندگی کی آخری حد تک اپنے منصب کی تنخواہ پانے کا حقدار ہوگا اور اسے قبل از وقت منصب سے الگ نہ کیا جا سکے گا' بشرطیکہ وہ جسمانی یا دماغی نقص کے باعث ادائے فرائض کی صلاحیت نہ کھو بیٹھے یا اس سے کوئی بہت بڑی بدعملی سرزد ہو نہ جائے۔ (آخری صورت میں وہ منصب کا اعزاز اور مشاہرہ دونوں کھو بیٹھے گا) سب سے آخر میں میری تجویز یہ ہے کہ جب کسی رکن کو ٹربیونل کے لیے مقرر کر دیا جائے تو ساتھ ہی اسے از روئے آئین سبکدوشی یا استعفاء کے بعد کوئی سرکاری عہدہ لینے کا حق نہ رہے' خواہ اس عہدے کے لیے انتخاب ضروری ہو یا محض تقرر۔ اس کے ساتھ مشاہرہ وابستہ ہو یا محض اعزازی ہو۔ یوں ٹربیونل کے ارکان مزید حرص جاہ سے بھی آزاد ہو جائیں گے اور کسی سیاسی پارٹی یا گروہ کے ساتھ وابستگی کی ترغیب سے بھی الگ رہیں گے۔ یوں ادائے فرائض میں انہیں غیر جانبداری کا انتہائی ممکن درجہ حاصل ہو جائے گا۔

البتہ یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا کہ ٹربیونل کے تمام ارکان ہمیشہ نتائج پر متفق رہیں گے۔ اس طرح ہمیں اتفاق رائے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اکثریت کے فیصلوں کو ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا' لیکن ٹربیونل کے فیصلے بالاتفاق ہوں یا بالاکثریت' انہیں بہرحال آخری اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے تمام اداروں' نیز پوری قوم کے لیے واجب التعمیل سمجھنا چاہیے اور ان میں سے کوئی فیصلہ اس وقت کالعدم ہوگا' جب اس کے خلاف ٹریبونل ہی کی طرف سے کوئی دوسرا فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ یہ آخری تحفظ بہت ضروری ہے' کیونکہ بہت ممکن ہے' کسی دوسرے موقع پر کوئی ٹریبونل ایک ہی مسئلے کے متعلق مختلف فیصلے پر پہنچ جائے۔ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہ ہونا چاہیے' نہ اس سے کچھ زیادہ ہے اور نہ اس سے کچھ کم۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب:

شہری اور حکومت

فریضہ اطاعت

جب امیر کا باقاعدہ انتخاب ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ پوری ملت کی طرف سے اس کی بیعت ہوگئی۔ یہ بیعت صرف اس اکثریت تک محدود نہ ہوگی' جس کے ووٹوں سے وہ منتخب ہوا' وہ اکثریت بھی اطاعت میں شامل ہوگی' جس نے اس کے خلاف ووٹ دیئے' کیونکہ تمام اجتماعی معاملات میں' جہاں شرعی قانون کی خلاف ورزی کا سوال سامنے نہیں آتا' اکثریت کی رائے ہی ملت کے ہر رکن پر حاوی سمجھی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱. يدالله على الجماعة ومن شذ شذ في النار.(۱)

جماعت پر خدا کا ہاتھ ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا' وہ جہنم میں گیا۔

۲. من فارق الجماعة شبراً فقد خلع الاسلام عن عنقه.(۲)

جو جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا' اس کی گردن سے اسلام کا حلقہ نکل گیا' یعنی وہ مسلمان نہ رہا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اگر حکومت شریعت کے عائد کردہ تقاضوں کو پورا کرے تو وہ شہریوں کی طرف سے مطلق اطاعت کی حقدار ہے۔ شہری مجبور ہیں:

على السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره.(۳)

سنیں اور اطاعت کریں۔ تنگی ہو یا کشائش' حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار۔

غرض ان سب کو حکومت کی پشتیبانی کے لیے متحد رہنا چاہیے اور اس اتحاد کے لیے انہیں اپنی تمام ذاتی راحتیں' مفاد' املاک' بلکہ جانیں قربان کرنے میں بھی دریغ نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

۱۔ ترمذی بہ روایت عبداللہ بن عمرؓ۔

۲۔ ابوداؤد اور احمد بن حنبل۔

۳۔ بخاری و مسلم بہ روایت عبادہؓ بن الصامت۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة.[1]

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور ان کے مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں' کہ ان کے لیے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو حکومت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر قائم ہے اور قانون اسلام کی پیروی کر رہی ہے' اسے پورا حق ہے کہ شہریوں کے تمام وسائل' جن میں ان کے ذاتی املاک اور زندگیاں بھی شامل ہیں' قربانی کے لیے طلب کرے یعنی جب ملت کے مفاد اور مملکت کی حفاظت کے لیے یہ ناگزیر ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں حکومت کو حق حاصل ہے کہ:

الف۔ زکوٰۃ کے علاوہ' جس کا حکم قطعی طور پر کتاب وسنت میں موجود ہے' ایسے اضافی محاصل عائد کر دے' جو ملت کی بہبود کے لیے ضروری سمجھے جائیں۔

ب۔ جب ضرورت محسوس کرے' خاص قسم کی نجی املاک' ذرائع پیداوار یا طبیعی وسائل کی نجی ملکیت پر پابندیاں عائد کر دے اور ان کا انتظام عوامی فائدے کے لیے مملکت خود سنبھال لے۔

ج۔ مملکت کی حفاظت کے سلسلے میں جبری فوجی خدمت انجام دینے کے لیے تمام سلیم الاعضاء شہریوں کو بلا لے۔

مسئلہ' جہاد

یہ کتاب صرف ان دستوری مسائل پر غور وفکر کے لیے مخصوص ہے' جو اسلامی مملکت کے تصور میں مضمر ہیں اور ہمیں اس میں ان آئینی تفصیلات پر بحث کی ضرورت نہیں' جو مملکت کی طرف سے شہریوں پر محاصل عائد کرنے یا انتظامی ضروریات کے مطابق دوسرے اقتصادی واجبات پورے کرانے کے سلسلے میں پیش آ سکتے ہیں' لیکن فوجی خدمت انجام دینے کے لیے شہریوں کے فرض کی نسبت چند لفظ ضرور کہہ دینے چاہئیں۔ یہ فرض بظاہر تصور جہاد سے متعلق ہے' جس کی تعبیر نہ صرف اسلام کے تقریباً تمام غیر مسلم نکتہ چینوں، بلکہ مسلم فقہا میں سے بھی بعض نے حد درجہ غلط طریق پر کی ہے۔

۱۔ سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۱۱۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لفظ جہاد "جاھدہ" سے مشتق ہے' جس کے معنی ہیں اس نے انتہائی کوشش کی یا اپنے اوپر انتہائی مشقت اٹھائی' یعنی اس امر کے خلاف' جو باطل اور شر ہو۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جذبات اور کمزوریوں کے خلاف انسان کی کوشش (جہاد النفس) کو جہاد اکبر قرار دیا[۱]۔ جس حد تک جہاد کا تعلق جنگ سے ہے' قرآن مجید نے اسے صرف دفاعی جنگ کے لیے استعمال کیا ہے' یعنی انسان کی مذہبی آزادی' ملکی آزادی اور ملی آزادی کے دفاع کے لیے:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر. الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز.[۲]

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے' اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے' کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے گھروں سے نکال دیے گئے' ان کا کوئی جرم نہ تھا' مگر یہ کہ وہ کہتے تھے' ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور دیکھو' اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم وتشدد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں' گرجے' عبادت گاہیں' مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ یاد رکھو' جو کوئی اللہ کی (سچائی) حمایت کرے گا' ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں' اللہ یقیناً قدرت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔

یاد رہے کہ قرآن میں مسئلہ جہاد کے متعلق یہ سب سے پہلا ارشاد ہے اور اس امر پر تمام معلوم احادیث متفق ہیں[۳]۔ مذکورہ بالا دو آیتوں میں قرآن ظلم وجبر کے خلاف دفاع نفس کا

۱۔ بیہقی کی کتاب السنن الکبریٰ ملاحظہ فرمائیے بہ روایت جابرؓ بن عبداللہ۔

۲۔ سورہ حج آیت نمبر ۳۸'۳۹۔

۳۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۳ھ) جلد پنجم صفحہ ۵۹۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی اصول پیش کرتا ہے جس کی بنا پر جنگ اخلاقاً حق بجانب ثابت ہو سکتی ہے۔ خانقاہوں' گرجوں' عبادت گاہوں اور مسجدوں کے ذکر سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ روحانی اور سیاسی آزادی کے دفاع کا یہ حق صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں' بلکہ تمام غیر مسلم قومیں بھی اس میں شامل ہیں' جو ان کے درمیان رہتی ہیں۔

اسلام کسی بھی حالت میں اپنے پیروؤں کو جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں دیتا:

۱. **وقاتلوا فی سبیل اللّٰه الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللّٰه لایحب المعتدین.** (۱)

جو لوگ تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں' چاہیے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی ان سے لڑو۔ البتہ کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔

۲. **وقاتلوهم حتي لاتكون فتنة ويكون الدين للّٰه فان انتهوا فلا عدوان الا على الظالمين.** (۲)

اور دیکھو' ان لوگوں سے لڑائی جاری رکھو' یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم وفساد) باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر یہ لوگ لڑائی سے باز آ جائیں تو (تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیے کیونکہ) لڑائی نہیں، مگر ان لوگوں کے مقابلے میں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

لاینهكم اللّٰه عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من ديارکم ان تبروهم وتقسطو اليهم ان اللّٰه يحب المقسطين. (۳)

جن لوگوں نے تم سے دین کے لیے جنگ نہیں کی اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا' اللہ اس سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو اور انصاف سے پیش آؤ۔ کیونکہ اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یہ فیصلہ کن قرآنی احکام تفسیر وتشریح سے بالکل بے نیاز ہیں۔ انہیں کی روشنی میں دیکھنا

۱۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۹۰۔

۲۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۹۳۔

۳۔ سورہ ممتحنہ آیت نمبر ۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے کہ جن روایات کے رو سے مسلمانوں پر جہاد واجب ہے' ان کی حیثیت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی جہاد کے فضائل و محاسن کا ذکر فرمایا تو حضورؐ کا ارشاد یا تو ان جنگوں کی طرف تھا' جو اس وقت پیش آ رہی تھیں یا مستقبل کی ان جنگوں کے متعلق تھا' جو قرآن مجید کی مقررہ شرائط جنگ کو اسی طرح پوری کرتیں' جس طرح حضورؐ کی جنگیں پوری کر رہی تھیں۔ ایسی ہی جنگیں ''فی سبیل اللہ'' ہو سکتی ہیں' یعنی خدا کی راہ میں (جہاد کی تقریباً تمام روایات میں یہ الفاظ وارد ہیں) انہیں کو حق بجانب اور شرعی نقطۂ نگاہ سے موجب ثواب قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی مملکت کا تصور قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ ایسی مملکت میں جارحانہ جنگ حکومت کے دائرے سے خارج ہے۔ درحقیقت حکومت ایسی جنگوں میں شہریوں کی اطاعت کی شرعاً حقدار نہیں ہو سکتی' کیونکہ یہ اصول واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کو معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ حکم اس کے لیے نہ سننا جائز ہے' نہ اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ شہری ایسے موقع پر وہ اصول عمل اختیار کرنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے' جسے آج کل کی اصطلاح میں ''ضمیر کی بنا پر اعتراض'' قرار دیا جاتا ہے' یعنی اخلاقی اعتبار سے کسی ناواجب مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے سے انکار۔ اس کے برعکس اگر مسلمانوں کو ملک پر بیرونی حملے کی روک تھام یا اندرونی بغاوت کے انسداد کے لیے دعوت دی جائے تو اس پر کسی مسلمان کی طرف سے اعتراض واختلاف جائز نہ ہوگا' کیونکہ ایسی جنگیں حقیقۃً فی سبیل اللہ ہوں گی اور ان میں موت شہادت عالیہ کا موجب ہوتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر سلیم الاعضا مسلمان کو جہاد میں حصہ لینا چاہیے۔ جہاد اس موقع پر ہوتا ہے' جب مذہب کی آزادی یا ملت کی سیاسی حفاظت معرض خطر میں ہو۔ جو مسلمان جسمانی اعتبار سے فوج میں شامل ہو کر لڑنے کے قابل نہ ہوں' انہیں چاہیے کہ دفاع کی عام شہری کوششوں میں حصہ لیں اور حتی الامکان مالی امداد دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> من جهز غازياً في سبيل الله فقد غزا ومن خلف غازيا في اهله فقد غزا.[1]
>
> جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے ہتھیار فراہم کرتا ہے' وہ بھی درحقیقت جہاد میں حصہ لیتا ہے اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے اہل وعیال کی خبر گیری کرتا ہے' وہ بھی جہاد میں حصہ لیتا ہے۔

۱۔ بخاری ومسلم بہ روایت زیدؓ بن خالد

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیز فرمایا:

من لم یغز ولم یجهز غازیاً اویخلف فی اهله بخیر اصابه الله بقارعة قبل یوم القیامة.(۱)

جو جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ نہیں لیتا' نہ کسی مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے ہتھیاروں کا انتظام کرتا ہے' نہ کسی مجاہد کے پیچھے چھوڑے ہوئے اہل وعیال کی خبر گیری میں حصہ لیتا ہے' خدا تعالیٰ قیامت سے پیشتر (اس کی زندگی میں) اسے مبتلائے مصیبت کرے گا۔

غرض ملت کے تمام بالغوں سے توقع ہے کہ وہ دشمن کے انسداد کی کوششوں میں حصہ لیں۔ مملکت کے مختلف اداروں کا یہ کام ہے کہ انفرادی کوششوں میں ربط پیدا کریں اور وقت کی ضرورت کے مطابق ایک عام نظام دفاع قائم کریں۔

مگر سوال یہ ہے کہ غیر مسلم شہریوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ قرآنی اصول ہے:

لَآ اکراہ فی الدین.(۲)

دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں۔

اس کے مطابق اسلامی احکام غیر مسلموں پر واجب نہیں ہو سکتے۔

جواب واضح ہے۔ اگر اسلامی مملکت کے ارباب اختیار جہاد کے قرآنی تصور کی پیروی کریں' جس کے مطابق صرف دفاعی جنگ جائز ہے تو مملکت کے دفاع کا فرض' جو غیر مسلموں کے لیے حفاظت کا سامان مہیا کرتی ہے' غیر مسلم شہریوں پر بھی واجب ہے' زیادہ تر اس لیے کہ اسلام جہاں ان کی مادی بہبود کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتا ہے' وہاں انہیں روحانی آزادی کی اجازت بھی دیتا ہے(۳)۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان غیر مسلموں پر اصرار نہ

۱- ابوداؤد بہ روایت ابوامامہؓ

۲- سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۵۶۔

۳- دیکھیے سورہ حج کی آیت نمبر ۳۹' جو پہلے نقل کی جا چکی ہے' یعنی گرجوں' خانقاہوں' عبادت گاہوں وغیرہ کی حفاظت۔ (مترجم) مسلمہ واقعہ ہے کہ غیر مسلموں میں سے دو ہزار جنگ حنین میں شامل تھے۔ انہیں طلقاء کہتے تھے اور حنین میں جو لوگ سب سے پہلے پریشانی کا باعث ہوئے' وہ یہی غیر مسلم نیز جدید الاسلام نوجوان تھے (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۸۸) غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کو شرکت سے کبھی نہ روکا۔ غالباً اسی مثال کے پیش نظر ہندوستان کے سلاطین غیر مسلموں سے اہم فوجی خدمات لیتے رہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا' جو زیر حفاظت رہتے تھے' یعنی اہل الذمہ تھے کہ وہ ان مہموں میں حصہ لیں' جو اسلام کے دفاع میں پیش آئیں۔ ساتھ ہی حضور نے غیر مسلموں کو حسب دلخواہ مسلمانوں کے دوش بدوش لڑنے سے کبھی نہ روکا۔ اس بارے میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان فرق صرف اس حد تک ہے کہ مسلمان کے لیے مذہبی احکام کے مطابق جہاد میں حسب ضرورت جان تک دے دینے کی پابندی ہے' غیر مسلم شہری سے تمام حالات میں اس طرز عمل کی پیروی نہیں کرائی جاسکتی۔ سمجھا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم شہریوں کی بہت بڑی تعداد نہ صرف آمادہ ہوگی' بلکہ دل سے خواہاں ہوگی کہ جو مملکت ان کی آزادی کی محافظ اور ان کے شہری حقوق کی ضامن ہے' اس کے دفاع میں پورا حصہ لے۔ تاہم سمجھا جاسکتا ہے کہ بعض غیر مسلم ۔۔۔ خصوصاً مسیحی ۔۔۔ سمجھ رہے ہوں کہ ہتھیار اٹھانا ان کے مذہبی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتا' لہٰذا فوجی خدمت میں شامل کیے جانے پر معترض ہوں۔ ایسے ہی معترضین کے لیے یہ اصول استعمال ہوگا کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ وہ ایک خاص ٹیکس ادا کرکے' جسے جزیہ کہتے ہیں' فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہو جانے کے حقدار ہیں (جزیہ کے لفظی معنی ہی یہ ہیں کہ فوجی خدمت کے بدلے میں محصول ادا کر دینا) اس محصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی شرح مقرر نہ فرمائی' لیکن احادیث سے ظاہر ہے کہ یہ شرح زکوٰۃ سے کمتر ہے۔ زکوٰۃ مسلمانوں پر واجب ہے اور یہ غیر مسلموں سے وصول نہیں کی جاتی' کیوں کہ یہ خاص اسلامی فرض ہے۔ غیر مسلمانوں میں سے بھی صرف وہ لوگ جزیہ ادا کریں گے' جو مسلمان ہوتے تو ان سے مملکت کی مسلح فوج میں شرکت کی توقع کی جاتی (نیز جزیہ ان سے لیا جاسکتا ہے' جو مالی اعتبار سے یہ محصول ادا کرنے کے قابل ہوں۔ یوں مندرجہ ذیل طبقے جزیے سے مستثنیٰ کر دیے گئے:

(الف) عورتیں
(ب) وہ لڑکے' جو بلوغ کو نہیں پہنچے
(ج) بوڑھے
(د) بیمار اور اپاہج
(ہ) محتاج
(ز) وہ لوگ' جو فوجی خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

حدود اطاعت

جہاد اور فوجی خدمت کے مسائل سے متعلق ضمنی بحث کے بعد ہمیں پھر اس نکتے پر آجانا چاہیے کہ اسلامی مملکت میں شہریوں پر کون کون سے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصیت سے توجہ طلب مسئلہ اطاعت کا ہے۔

جب تک مملکت اصولاً شرعی تقاضوں اور طور طریقوں کی پابند رہے' ایک مسلمان شہری کا فرض یہی ہے کہ اس حکومت کی اطاعت ایک مذہبی فرض کی حیثیت میں کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من خلع يداً من طاعة لقى الله يوم القيامة ولا حجة له ومن مات وليس فى عنقه بيعة مات مية جاهلية.(۱)

جو شخص (امیر کی) اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے وہ قیامت کے دن خدا سے ملے گا تو اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی (اپنی تائید میں کچھ پیش نہ کر سکے گا) اور جو مر گیا اور اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ اطاعت امیر نہیں' اس نے جاہلیت کے دور کی موت پائی (یعنی غیر مومن مرے گا)

قرآن وسنت میں اسلامی اتحاد پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق اتحاد میں رخنہ اندازی کی کوشش بہت بڑا جرم سمجھا جانا چاہیے، بلکہ یہ ملک وملت سے غداری کے مترادف ہے اور اس کی سزا بھی سخت ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا:

۱۔ ايما رجل خرج يفرق بين امتى فاضربوا عنقه.(۲)

جو بھی میری امت میں تفرقہ ڈالے' اس کی گردن اڑا دی جائے۔

۲۔ من اطاعكم وامركم جميعٌ على رجلٍ واحدٍ يريد ان يشق عصاكم اويفرق جماعتكم فاقتلوه.(۳)

جب تم لوگ ایک آدمی کی قیادت پر متحد ہو اور کوئی آدمی آ کر تمہاری قوت کو توڑنے اور تمہارا اتحاد درہم برہم کرنے لگے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔

بہر حال حکومت کے ساتھ' جس کا نمائندہ امیر ہوتا ہے' مسلمان کی اطاعت کا فرض غیر مشروط نہیں۔ اس کائنات کی سب سے اعلیٰ اور ارفع ہستی یعنی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کی پہلی شرط یہ قرار دی ہے کہ ایک شخص میں اس اطاعت سے پیدا ہونے والے واجبات کو پورا کرنے کی صلاحیت ہو۔ عبداللہ بن عمر کی روایت ہے:

۱۔ مسلم بہ روایت عبداللہ بن عمرؓ۔
۲۔ نسائی بہ روایت اسامہ بن شریک۔
۳۔ نسائی بہ روایت عرفجہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

كنا اذا بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة يقول لنا في استطعتم.(۱)

جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا حلف اٹھاتے کہ ہم حضورؐ کے ارشادات سنیں گے اور فرمانبرداری کریں گے تو حضورؐ فرماتے ''جس حد تک تم میں استطاعت ہو۔''

ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیرووں پر کبھی کوئی ایسا فرض عائد نہیں کیا' جو ان کی استطاعت سے باہر ہو۔ ملت کے لیے مقنن کی حیثیت میں حضور یہ واضح فرما دینا چاہتے تھے کہ دنیوی اقتدار کے لیے سمع و طاعت بعض پابندیوں سے مشروط ہے۔ مثلاً ایسی جسمانی نااہلیت' جو شہری کی دسترس سے باہر ہو' نیز اخلاقی عذر' آخری حد بندی کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاطاعة في معصية انما الطاعة في المعروف.(۲)

گناہ کے کاموں میں قطعاً اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔

متعدد دوسری احادیث میں بھی اسی قسم کے جملے استعمال فرمائے' مثلاً

۱. لاطاعة لمن لم يطع الله.(۳)

جو شخص خدا کا فرمانبردار نہیں' اس کی اطاعت نہ کرنی چاہیے۔

۲. لاطاعة لمن عصى الله تعالى.(۴)

جس نے خدا کی نافرمانی کی' اس کی اطاعت نہ کرنی چاہیے۔

ان تمام ارشادات میں شہری کا یہ حق اور فرض واضح ہے کہ وہ حکومت کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور انتظامی و تقنینی پالیسی پر نکتہ چینی کرے' بہ شرطیکہ اسے معلوم ہو جائے معاملات غلط صورت اختیار کر رہے ہیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

۱- بخاری و مسلم بہ روایت عبداللہ بن عمر۔

۲- بخاری و مسلم بہ روایت علیؓ۔

۳- احمد بن حنبل بہ روایت معاذ بن جبلؓ۔

۴- ایضاً بہ روایت عبادہ بن صامتؓ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت سے ارشادات میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ بدیہی باطل کے خلاف آواز اٹھانا ایک مسلمان کا اولین فرض ہے' خصوصاً اس حالت میں کہ غلطی کا ارتکاب حکومت کی طرف سے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ افضل الجهاد من قال كلمة الحق عند سلطان الجائر۔ (۱)

جہاد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ سچی بات حکومت سے کہی جائے' جب وہ راہ حق سے منحرف ہو۔

۲۔ من رای منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان۔ (۲)

تم میں سے جو شخص کوئی شر و باطل دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ ہاتھ کی قوت سے اسے درست کرے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے (برا کہے) اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل میں برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدی اور باطل کو زور عمل سے ختم کرنا ایمان کا سب سے اونچا درجہ تصور فرماتے تھے اور ایک بے انصاف وظالم حکومت کے متعلق بھی شہریوں کی روش کے سلسلے میں اسی اصول کا اطلاق ہونا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے حکومت کے خلاف شہریوں کے لیے حق بغاوت ثابت ہوتا ہے' جب وہ شہری قوانین کے خلاف گام زن ہو؟ بداہتہً اس کا جواب نفی میں ہے' کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا:

من بايع اماماً فاعطاه صفقته يده وثمرة قلبه فليطعه استطاع (۳)

جس نے کسی امام کے ہاتھ پر اطاعت کا حلف اٹھایا اور دل کا ثمر اس کے حوالے کیا تو جس وقت تک ممکن ہو اس کی اطاعت کرے۔

مطلب یہ ہوا کہ جس حد تک امام اسلامی اقدار عموماً قائم رکھے اور عمداً مقاصد سے دست بردار نہ ہو۔ وقتاً فوقتاً کسی لغزش کا سرزد ہو جانا شہریوں کو اجازت نہیں دیتا کہ اس کی حکومت

۱۔ ابوداؤد' ترمذی وابن ماجہ بہ روایت ابوسعید الخدری۔

۲۔ مسلم بہ روایت ابوسعید الخدری۔

۳۔ مسلم بہ روایت عبداللہ بن عمر۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف بغاوت کر دیں، کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک ملت کی اکثریت اس کے خلاف اعلان نہ کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من رای من امیرہ شیئا فکرہ فالیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ فیموت الامات میتۃ جاھلیۃ۔ (۱)

جو شخص اپنے امیر سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے بری لگے تو صبر کرے، کیونکہ جو بھی جماعت سے جدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے (یعنی کفر کی موت)

پھر شہریوں کو کس حد تک ایک بے انصاف وظالم حکومت پر صبر کیے بیٹھے رہنا چاہیے؟ اس کا جواب متعدد احادیث میں ملتا ہے، خصوصاً مندرجہ ذیل دو حدیثوں میں، جنہیں یک جا پڑھنا چاہیے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم قلنا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افلاننا بذھم عند ذلک قال لاما اقاموا فیکم الصلوٰۃ لاما اقاموا فیکم الصلوٰۃ۔ (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے بہترین امام وہ ہیں، جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تم ان کو دعائیں دیتے ہو وہ تم کو دعائیں دیتے ہیں۔ تمہارے بدترین امام وہ ہیں، جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتے ہیں۔ تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہم نے (جو صحابہؓ موقع پر موجود تھے) عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں ہم ان کا تختہ الٹ دیں"؟ فرمایا۔ "نہیں، جب تک تم میں نماز قائم رکھیں۔ نہیں، جب تک تم میں نماز قائم رکھیں۔"

۱۔ بخاری و مسلم بہ روایت عبداللہ بن عباس۔
۲۔ مسلم بہ روایت عوف بن مالک اشجعی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں نماز قائم رکھنے کا معاملہ نماز باجماعت قائم رکھنے سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ قرآن مجید کی دوسری سورت (۱) کے آغاز کی طرح اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کو مثبت حیثیت میں قائم رکھا جائے۔ دوسری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبادہ بن صامت کی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ قال فیما اخذ علینا عن بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لاننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیعت کے لیے بلایا اور ہم پر یہ فرض عائد فرمایا کہ ہم حضورؐ کا ارشاد سنیں اور اطاعت کریں' خواہ وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث ہو یا ناخوشی کا ہمیں تکلیف ہو یا راحت اور ہماری ذاتی رائے خواہ کچھ ہو اور (ہم پر زور دیا کہ) جن لوگوں کو حکم واختیار سونپا جا چکا ہے' ان سے یہ منصب واپس لینے کی کوشش نہ کریں' جب تک ان سے صریح کفر سرزد نہ ہو' جس کے لیے اللہ (کی کتاب) میں واضح ثبوت موجود ہو۔

اس معاملے متعلق جتنی روایتیں ہیں' ان سے چار نکتے بالکل واضح ہوتے ہیں:

۱۔ جب تک امیر از روئے آئین قائم شدہ حکومت کا نمائندہ ہے تمام شہریوں پر اس کی فرمانبرداری واجب ہے' خواہ اس کی شخصیت اور وقتاً فوقتاً اس کے انتظامی کاروبار سے یہ

۱۔ قرآن مجید سورہ بقرہ آیت نمبر ۳ (ہم نہ سمجھ سکے کہ اس سے فاضل مصنف کا مقصود کیا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیتیں یہ ہیں۔

الم' ذلک الکتاب لاریب فیہ' ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوۃ

تیسری آیت کا ترجمہ یہ ہے (متقی انسان وہ ہیں' جو غیب کی حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ روزی انہیں دے رکھی ہے اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں) یعنی صلوٰۃ وزکوٰۃ کو متقیوں کی دو خصوصیتیں بتایا گیا۔ اسی طرح آگے چل کر قرآن مجید اور پیشتر کی آسمانی کتابوں پر نیز آخرت پر ایمان ویقین ضروری قرار دیا گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ فاضل مصنف نے معانی میں جس توسیع کا ذکر کیا' اس کی حقیقت کیا ہے۔ (مترجم)

۲۔ بخاری بہ روایت عبادہ بن صامت۔ اس سے تقریباً ملتی جلتی روایت صحیح مسلم میں بھی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا وہ کتنا ہی ناخوش ہو۔

۲۔ اگر حکومت کی طرف سے ایسے قوانین یا ضوابط جاری ہوتے ہیں، جن پر عمل شرعاً گناہ سمجھا جا سکتا ہے تو ان قوانین وضوابط کے سلسلے میں فریضہء اطاعت ختم ہو جاتا ہے۔

۳۔ اگر حکومت علاناً اور عمداً قرآن کے نصی کسی حکم کے خلاف عمل شروع کر دیتی ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ کفر کی مرتکب ہوئی۔ اس حالت میں اس سے منصب اختیار واپس لے لینا چاہیے۔

۴۔ یہ مناسب نہیں کہ ملت کی اقلیت منصب اختیار کی واپسی کے لیے مسلح بغاوت کر دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متنبہ فرما دیا۔

ا. من حمل علینا السلاح فلیس منا. (۱)

جس نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے، وہ ہم میں سے نہ رہا (یعنی اسلامی جماعت سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا)

ب. من حمل علینا السیف فلیس منا. (۲)

جس نے ہمارے خلاف تلوار بے نیام کی وہ ہم میں سے نہ رہا۔

غرض ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اختیار دے دیا ہے، وہ حکومت کے خلاف شریعت احکام کی فرمانبرداری نہ کریں اور اگر اس کی روش صریح کفر کی سی ہو

۱۔ بخاری ومسلم بہ روایت عبداللہ بن عمرو ابو ہریرہؓ۔

۲۔ مسلم بہ روایت سلمہ بن الاکوعؓ۔

(مترجم) یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ من حمل علینا السلاح یا من حمل علینا السیف سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا گیا، یہ صرف اقلیت کی مسلح بغاوت کے خلاف ہیں؟ بظاہر ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو باہم لڑائی چھیڑنے میں عجلت اور تیزی نہ کرنی چاہیے ضروری ہے کہ ہر معاملے کو گفت وشنید کے ذریعے سے طے کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا جائے۔ اگر اقلیت کا ہتھیار اٹھانا ان حدیثوں کی زد میں آتا ہے تو اکثریت کے ہتھیار اٹھانے کو کس بنا پر باہر رکھا جا سکتا ہے، جب یہاں "علینا" کے بارے میں کوئی تصریح موجود نہیں؟ ان حدیثوں سے استدلال کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فاضل مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں، لیکن صحیح راہ عمل یہی ہے کہ آخری فیصلہ رائے عامہ کی بنا پر کیا جائے اور اکثریت کا حق تسلیم کر لیا جائے، مگر ایک صورت قابل توجہ ہے۔ فرض کیجیے کہ اکثریت امیر کے خلاف فیصلہ کر دیتی ہے، لیکن امیر اقلیت کو ساتھ لے کر مسلح مخالفت شروع کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں یہی کہا جائے گا کہ جو ہمارے خلاف ہتھیار اٹھاتا ہے اور ہمارے خلاف تلوار بے نیام کرتا ہے، یعنی ملت کی اکثریت کے خلاف، وہ اس مخالفت کے دوران میں ملت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے تو اسے معزول کر دیں' لیکن قرآن و سنت نے جماعتی اتحاد کے اصول پر بڑا زور دیا ہے۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے یہ معاملہ انفرادی شہریوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا کہ کب امیر کی فرمانبرداری کو ختم کرنا مذہبی اور شہری حق ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے فیصلے ملت بہ حیثیت مجموعی ہی کر سکتی ہے یا مناسب طریق پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے سے یہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے' کہا جائے کہ مجلس شوریٰ ایسے معاملے کا فیصلہ کرنے کی حقدار ہے' لیکن اس کے خلاف یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ امیر اور مجلس کی رایوں میں اختلاف کی بنا پر ناقابل حل تعطل پیدا ہوتے رہیں گے' تاوقتیکہ کسی غیر جانب دار ثالثی نظام سے رجوع نہ کیا جائے' یعنی اعلیٰ ٹربیونل سے۔ میں گزشتہ باب میں بتا چکا ہوں کہ اس ٹربیونل کا ایک فرض یہ بھی ہوگا' جو قوانین یا انتظامی ضابطے شریعت سے متناقض ہوں' ان پر خط تنسیخ کھینچ دے۔ اگر کسی امیر کے خلاف یہ الزام عائد ہو کہ وہ عمداً شریعت اسلام کے خلاف حکومت کا کاروبار چلا رہا ہے تو یہ بھی ٹربیونل ہی کا کام ہوگا کہ اس امیر کے عزل پر استصواب رائے عامہ کا انتظام کرے۔ اگر استصواب میں ملت کی اکثریت امیر کے خلاف رائے دے تو از روئے آئین اسے معزول سمجھنا چاہیے۔ ساتھ ہی عوام کا حلف اطاعت کالعدم ہو جائے گا۔

یوں حکومت کے کاروبار پر شہریوں کی نگرانی کے فرض' اس پر نکتہ چینی کے حق اور آخر میں اس کے عزل کو کسی فرد یا گروہ افراد کے حق بغاوت سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے' جو قطعاً موجود نہیں۔ صرف ملت کی اکثریت کے فیصلے کے مطابق قائم شدہ اسلامی حکومت اختیار سے محروم کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہو تو پرامن ذرائع سے یہ کام انجام دیا جائے' ضرورت پیش آ جائے تو قوت بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔

آزادی رائے

یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف حکومت کی معزولی ہی کا مسئلہ نہیں ۔۔۔ جس سے غالباً بہت کم سابقہ پڑے ۔۔۔ جس کے متعلق مسلم شہری کو اپنی انتقادی صلاحیتوں یا اخلاقی جرأت سے کام لینا چاہیے تاکہ حق و انصاف قائم ہو جائے۔ قرآن مجید کے مطابق مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں کہیں اسے بدی' شر اور باطل نظر آئے' اس کا مقابلہ کرے اور قیام حق و انصاف کے لیے کوشاں رہے' جب لوگ اس سے بے پروا ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

والذی نفسی بیدہ لتأمرن بالمعروف وتنهون عن المنكر

اولیو شکن اللہ ان یبعث علیکم عذاباً من عندہ ثم لتدعنہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولا یستجاب لکم.(۱)

اس ذات کی قسم، جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہارا فرض ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے منع کرو، ورنہ خدا یقیناً تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب مسلط کر دے گا۔ پھر تم اللہ کو پکارو گے، مگر وہ تمہیں جواب نہ دے گا۔

خدا کی طرف سے عذاب ان افراد تک محدود نہ ہوگا، جنہوں نے ادائے فرض میں سستی کی۔ اس سے پوری ملت کی تقدیر پر زد پڑ سکتی ہے، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا:

کلا واللہ لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر ولتأخذن علی یدی الظالم ولتأطرنه علی الحق أطراً ولتقصرنه علی الحق قصراً اولیضربن اللہ قلوب بعضکم علیٰ بعض.(۲)

نہیں، خدا کی قسم، تمہیں ضرور نیکی کا حکم دینا چاہیے، بدی سے روکنا چاہیے۔ تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑنا چاہیے اور اسے موڑ کر حق کے مطابق بنانا چاہیے اور مجبور کر کے حق کا پابند بنانا چاہیے، ورنہ خدا تم میں سے بعض کے قلوب بعض کے مخالف بنا دے گا۔

نیز فرمایا:

اذرأوا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیه اوشک ان یعمهم اللہ بعقابه.(۳)

اگر لوگ کسی کو ظلم کرتا ہوا دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ روکیں تو اغلب ہے، خدا ان سب کو اپنے عذاب کے گھیرے میں لے لے۔

اس حدیث کی ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن قوم یعمل فیهم بالمعاصی ثم یقدرون علیٰ ان یغیروا ثم لا یغیرون الا یوشک ان یعمهم اللہ بعقاب.(۴)

ایک قوم کے درمیان گناہوں کا ارتکاب جاری ہے، جنہیں درست کرنے پر

۱- ترمذی بہ روایت حذیفہؓ۔
۲- ابوداؤد بہ روایت عبداللہ بن مسعودؓ۔
۳- ابوداؤد بہ روایت ابوبکرؓ۔
۴- ابوداؤد بہ روایت ابوبکرؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ قادر ہے، مگر درست نہیں کرتی۔ اغلب ہے خدا کا عذاب اسے کاملاً اپنے گھیرے میں لے لے۔

غرض پوری ملت کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ارکان جہاں اور جس حد تک موقع پائیں، اخلاقی وعمرانی حالات کی درستی کے لیے کوشاں رہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

ان الله لایغیر مابقوم حتیٰ یغیروا مابانفسهم.(۱)

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے جب تک وہ خود ہی اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ایک قوم کی اخلاقی روش اور خارجی حالات کے باب میں باہم دگر انحصار کا یہ قانون دونوں حیثیتوں میں یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے اخلاقی نظام میں اصلاح ہوگی تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ اس کی مادی بہبود اور سیاسی قوت بہت بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اخلاقی انحطاط یقیناً عمرانی، اقتصادی اور سیاسی انحطاط کا باعث ہوگا۔

کسی قوم کی اخلاقی اور عمرانی اصلاح کی طرف مثبت تغیر اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے، جب قوم اس کی ضرورت سے باخبر ہو' لہٰذا ہر صاحب فکر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے عمرانی ماحول پر گہری نظر رکھے اور مسلسل نکتہ چینی کرتے ہوئے عوامی بہبود کے لیے صدا بلند کرتا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاحسد الافی اثنین رجل اعطاه الله مالاً فسلطه علیٰ هلكته فی الحق ورجل اعطاه الحكمة فهو یقضی بها ویعلمها.(۲)

صرف دو قسم کے آدمی ہیں، جن پر بجا رشک کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جسے خدا نے دولت عطا کی اور ساتھ ہی ہمت دے دی کہ اسے حق کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسرا وہ جسے خدا نے حکمت دے دی وہ اسی کے مطابق خود عمل کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دوسروں کو دیتا ہے۔

غرض نقد ومشورہ کا فرض ـــ جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے شعور شہریت کے صحیح نشو وارتقاء کے لیے حد درجہ ضروری ہے ـــ ایک مسلم شہری کے نظریات واجبات پر ختم نہیں ہوجاتا، جو

۱- سورہ رعد آیت نمبر ۱۱۔

۲- بخاری ومسلم بہ روایت ابن مسعودؓ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوم کی طرف سے اس پر عائد ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقی اسلامی زندگی میں ان تمام معاملات کے متعلق مسلسل اجتہاد مضمر ہے اور اس کی ضرورت ہے' جن کا ذکر قانونی حیثیت سے قرآن وسنت کے یقینی اور واضح نصوص میں نہیں آیا اور اجتہاد کی آزادی اس وقت اقتصادی و عمرانی فرض بن جاتی ہے' جب اجتماعی مسائل زیر بحث ہوں۔ بہ الفاظ دیگر ملت کے مذہبی لیڈروں پر اخلاقاً واجب ہے کہ اجتماعی ترقی کے لیے جو نئے افکار انہیں سوجھیں' انہیں پیش کریں اور عوام کے روبرو ان کی وکالت کرتے رہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی مملکت کے ہر شہری کا ایک بنیادی حق یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار تقریر وتحریر کے ذریعے سے کرتا رہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اظہار رائے کی یہ آزادی قانون اسلام یا قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال نہ ہونی چاہیے۔ اس آزادی میں طبعاً آزادی مطابع بھی شامل ہے۔ مزید برآں کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیے' جو تہذیب وشائستگی عامہ کے منافی ہو۔

شہریوں کی حفاظت

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان کا آئین ہی نہیں' بلکہ اخلاقی فرض بھی ہے کہ ذاتی مفاد کو ہمیشہ مملکت مفاد عامہ کے تابع رکھے اور یہ امر اس اصول پر مبنی ہے کہ اسلامی مملکت روئے زمین پر خدا کی نائب ہے۔ ظاہر ہے کہ شہریوں کی اطاعت کے لیے مملکت کا مذہبی دعویٰ یک طرفہ نہیں ہونا چاہیے' یعنی سلطنت اور شہری کے درمیان تعلق محض اس حد تک محدود نہیں کہ مملکت نے شہری پر کچھ واجبات عائد کر دیے یا اسے بعض امور میں آزادی دے دی' مثلاً اظہار رائے کی آزادی' حکومت کے قیام اور اس کے عزل کے لیے ووٹ دینے کا حق۔ ضروری ہے کہ مملکت بھی شہری کے لیے چند واضح اور مثبت واجبات قبول کرے۔

مسلمان شہریوں کا فرض یہ ہے کہ مملکت کے لیے فوجی خدمت انجام دیں۔ اسی کا ضمیمہ ہے کہ مملکت کو داخلی اور خارجی دشمنوں سے شہریوں کی حفاظت کا ذمہ اٹھانا چاہیے۔ اس طرح جہاں شہریوں کے لیے ضروری ہے کہ از روئے آئین قائم شدہ حکومت کی عزت وحرمت کا خیال رکھیں' وہاں حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ شہریوں کی نجی زندگیوں کی حفاظت کرے۔ اسلام کے ضروری احکام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جو خطبہ دیا' اس میں فرمایا:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان دماء کم و اموالکم حرامٌ علیکم کحرمت یومکم هذا.(۱)

دیکھو' تمہاری جانیں اور تمہارے مال اسی طرح واجب الاحترام ہیں جس طرح آج کا یوم (یوم الحج) واجب الاحترام ہے۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمه' وماله وعزه.(۲)

ہر مسلمان کا خون' جائداد اور آبرو تمام دوسرے مسلمانوں کے نزدیک واجب الاحترام ہونے چاہئیں۔

ان ارشادات نیز قرآن وسنت کے دوسرے احکام کو ملا کر دیکھا جائے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شہریوں کی جانوں' شخصیتوں اور اموال کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق ایک دفعہ دستور میں شامل کر دی جائے' یعنی کسی کی جان' آزادی اور جائداد پر تصرف کا حق حاصل نہ ہوگا' مگر قانون وآئین کے مطابق۔

مملکت کو شہریوں کی حفاظت کے لیے جو انتظامات کرنے چاہئیں' وہ ان چند بدیہی معاملات یعنی شخصیتوں اور جائدادوں وغیرہ ہی تک محدود نہیں' بلکہ ان میں شہریوں کے وقار' آبرو اور ان کے گھروں کی پردہ داری بھی شامل ہے قرآن مجید میں ہے۔

۱. ویل لکل همزة لمزة(۳)

افسوس ہے ہر عیب لگانے والے اور طعن کرنے والے پر۔

۲. یاایها الذین امنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً.(۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' بہت بدگمانی سے بچو۔ کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔ نہ ایک دوسرے کی جاسوسی کرو' نہ ایک دوسرے کی چغلی کھاؤ۔

اسی خیال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو تنبیہ فرمائی:

۱. ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا.(۵)

۱۔ مسلم بہ روایت جابرؓ بن عبداللہ ۔ ۲۔ مسلم بہ روایت ابوھریرۃؓ
۳۔ سورہ ہمزہ آیت نمبر۱ ۔ ۴۔ سورہ حجرات آیت نمبر۱۲
۵۔ مالک بن انس بہ روایت ابوہریرہؓ اس حدیث کے تقریباً یہی الفاظ بخاری ومسلم اور ابوداؤد میں منقول ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدگمانی سے بچو' کیونکہ بدگمانی نہایت غلط بات پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور ایک دوسرے کی مخفی کمزوریاں تلاش کرنے کی کوشش نہ کرو۔

۲. ولاتؤذوا المسلمین ولاتعیروا ولاتتبعوا عوراتھم فانہ من یتبع عورت اخیہ المسلم یتبع اللہ عورتہ'. (۱)

مسلمانوں کو اذیت نہ پہنچاؤ۔ ان سے برائی منسوب نہ کرو۔ ان کی برہنگی عریاں کرنے کے پیچھے نہ پڑو۔ دیکھو! اگر کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی برہنگی عریاں کرتا ہے تو خدا اسی کی برہنگی عریاں کرتا ہے۔

آخر میں فرمایا:

ان الامیر اذا اتغی الریبۃ فی الناس افسدہ. (۲)

اگر امیر لوگوں پر شک کرنے لگے تو وہ انہیں بددیانتی پر آمادہ کرے گا۔

ان تمام آیات کو قرآن مجید کی اس آیت سے ملا کر پڑھیے۔

یاایھا الذین امنوا لاتدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا الی اھلھا. (۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے اپنے گھروں کے سوا (دوسرے) گھروں میں داخل نہ ہو' یہاں تک کہ اجازت لے لو اور ان میں رہنے والوں کو سلام کرو۔

یہ معاملہ بھی دستوری ضابطے کا محتاج ہے' جس سے شہریوں کے گھر' ان کی نجی زندگیاں اور آبروئیں محفوظ ہو جائیں گی' اور حکومت ان سرگرمیوں سے باز رہنے پر مجبور ہوگی' جو ان بنیادی حفاظتوں سے متناقض ہیں اسی طرح تمام شہری۔۔۔ان لوگوں کے سوا جو پہلے سے سنگین جرم کے مرتکب ثابت ہو چکے ہوں۔۔۔خفیہ پولیس کی نگرانی سے محفوظ ہو جائیں گے اور ایسی نگرانی ایک حقیقی اسلامی مملکت میں بالکل خارج از بحث ہوگی۔ کسی کو محض شبہے کی بنا پر گرفتار کر لینا دستور کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا اور مقدمہ چلا کر کسی باقاعدہ عدالت سے فیصلہ حاصل کیے بغیر کسی شہری کی قید یا نظر بندی ان اصول حرمت کے خلاف جائے گی' جو قرآن وسنت نے واضح طور پر بیان کر دیے۔

۱۔ ترمذی بہ روایت عبداللہؓ بن عمرؓ۔ ۲۔ ابوداؤد بہ روایت ابوامامہ۔

۳۔ سورۂ نور آیت نمبر ۲۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفت اور لازمی تعلیم

حکومت کی سرگرمیوں پر خاص توجہ رکھنے کے سلسلے میں شہری کے فرائض کی ایک منطقی شق' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' یہ ہے کہ اسے آزادی رائے اور آزادی اظہار کا حق حاصل ہے' جسے اسلام نے ملت کے تمام بالغ افراد کے لیے محفوظ کر دیا ہے' لیکن اظہار رائے کا حق اور فرض بالکل بے معنی رہ جائے گا۔۔۔ اور بعض اوقات معاشرے کے بہترین مفاد کے لیے نقصان رساں ہو جائے گا۔ اگر ظاہر کردہ آراء فکر محکم پر مبنی نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر فرد کو پختہ علم حاصل ہونا چاہیے' لہٰذا شہری کا حق ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسا نظام تعلیم مہیا کرے' جس کے ذریعے سے مملکت کے تمام مرد و زن مفت تعلیم پا سکیں۔ قرآن وسنت تحصیل علم کے متعلق احکام سے لبریز ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار مواقع پر علم کی اعلیٰ قدر و قیمت کی تصریح فرمائی' مثلاً

من سلک طریقا یلتمس فیه علماً سهل الله له به طریقاً الی الجنة.(۱)

اگر کوئی شخص علم کی تلاش میں راستہ اختیار کرتا ہے تو خدا اس کی برکت سے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔

۲. فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب.(۲)

عالم کو صرف عبادت گزار پر وہی فضیلت حاصل ہے جو چودھویں کی رات کے چاند کو تمام دوسرے ستاروں پر حاصل ہوتی ہے۔

مزید فرمایا:

۱. فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادنکم.(۳)

عالم کو نرے عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے تم میں سے کسی عامی آدمی پر ہے۔

۲. طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة.(۴)

۱- مسلم بہ روایت ابوہریرہؓ۔ ۲- ترمذی، ابوداؤد اور احمد بن حنبل بہ روایت ابوداؤد۔

۳- ترمذی بہ روایت ابوامامہ الباہلی ۴- ابن ماجہ بہ روایت انس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم کی طالب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت دعوت اسلام کی بنا پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے اور زیر اقتدار خطوں میں شریعت اسلام قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف تعلیم کا انتظام کرے، بلکہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے تحصیل علم لازم کر دے۔ ایسی مملکت کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زندگی کی ایسی تمام سہولتیں غیر مسلم شہریوں کے لیے بھی مہیا کرے۔ گویا تعلیم تمام شہریوں کے لیے مفت اور لازمی ہونی چاہیے، خواہ ان کا مذہب کچھ ہو۔

اقتصادی تحفظ

سب سے آخر میں شہریت کی کامل اطاعت کے دعوے کے لیے وجہ جواز مہیا کرنے کی غرض سے مملکت کو شہریوں کی مادی بہبود کی ذمہ داری سرگرمی سے سنبھالنی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں مملکت کی ذمہ داری یہ ہے کہ شہریوں کے لیے ایسی اقتصادی سہولتیں بہم پہنچائے، جو انسانی راحت و وقار قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں۔ اس اصول کی توضیح کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ ذیل ارشاد پیش نظر رکھ لیا جائے۔

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فلامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیته والرجل راع علی اھل بیته وھو مسئول عن رعیته والمرأة راعیة علی اھل بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولة عنھم وعبدالرجل راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنه الا فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته (۱)

دیکھو، تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص اپنے ریوڑ کے لیے ذمہ دار ہے۔ اسی طرح امام (یعنی حکومت) جو لوگوں پر مقرر ہوا ہے، چرواہا ہے اور اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے اور ہر مرد اپنے کنبے کے لیے چرواہا ہے اور اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھربار اور بچوں کے لیے چرواہی ہے، وہ بھی اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے۔ ملازم اپنے آقا کی جائداد کے لیے چرواہا ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے۔ دیکھو، تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص اپنے ریوڑ کے لیے جواب دہ ہے۔

۱- بخاری و مسلم بہ روایت عبداللہ بن عمرؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوانندہ کتاب نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس حدیث میں شہریوں کے لیے حکومت کی ذمہ داری کو بچوں کے لیے باپ یا ماں کی ذمہ داری کے برابر رکھا گیا ہے۔ جس طرح باپ چرواہا ہے' یعنی محافظ و مربی' اخلاقاً اور قانوناً وہی کنبے کی کفالت و بہبود کا ذمہ دار ہے' اسی طرح حکومت بھی اخلاقاً اور قانوناً شہریوں کی اقتصادی بہبود کی ذمہ داری ہے' جن کے معاملات کا انتظام اس کے حوالے ہوا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ خیال رکھے' کسی شخص کا معیار معیشت منصفانہ سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔ اگرچہ اسلام نے واضح کر دیا کہ انسانی زندگی محض جسمانی زندگی تک محدود نہیں ۔۔۔ زندگی کی علت غائی اصلاً روحانی ہے ۔۔۔ مسلمان کو حق حاصل ہے کہ روحانی حقائق و اقدار کو انسانی زندگی کے جسمانی عوامل سے الگ نہ سمجھے۔ غرض اسلام ایک ایسے معاشرے کا متقاضی ہے' جو صرف اخلاقی نقطہء نگاہ ہی سے راستباز نہیں' بلکہ عملاً بھی راستباز ہے۔ ایک ایسا معاشرہ' جو اپنے افراد کے لیے صرف روحانی ضرورتوں ہی کا کفیل نہیں' بلکہ جسمانی ضرورتوں کا بھی ذمہ دار ہے۔ غرض مملکت اسی صورت میں حقیقۃً اسلامی بن سکتی ہے کہ ملت کے معاملات کا انتظام ایسے طریق پر کیا جائے' جس میں ہر فرد' مرد ہو یا عورت' اقل مالی بہبود سے مستفید ہو سکے' یعنی وہ بہبود' جس کے بغیر نہ انسانی شرف باقی رہتا ہے' نہ حقیقی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ نہ روحانی ترقی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یقیناً یہ نہیں کہ مملکت کو تمام شہریوں کے لیے سہل اور بے خلش زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دینا چاہیے۔ نہ کوئی مملکت ایسا کرے گی' نہ کر سکتی ہے' اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اولاً اسلامی مملکت میں فراوانی کے پہلو بہ پہلو روح فرسا افلاس نہ ہونا چاہیے۔ ثانیاً مملکت کے تمام وسائل سے اس طرح کام لینا چاہیے کہ تمام شہریوں کے لیے روزگار کے مناسب وسائل مہیا ہو جائیں۔ ثالثاً ایسے تمام مواقع تمام شہریوں کو حاصل رہنے چاہیں اور کسی شخص کو یہ موقع نہ دینا چاہیے کہ دوسروں کے نقصان پر اعلیٰ معیار معیشت حاصل کر لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً. (۱)

ایک صاحب ایمان اور دوسرے صاحب ایمان کی مثال ایک عمارت کے حصوں کی سی ہے۔ ہر حصہ دوسرے کے لیے وجہ تقویت ہے۔

یوں ہر دائرہء حیات میں تعاون اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اور کوئی مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی' جب تک وہ قانونی ذرائع سے اس تعاون کو جاری نہ کرے۔ اس طرح شہریوں کو ان

۱۔ بخاری و مسلم بہ روایت ابو موسیٰؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر مبنی ہیں۔

۱. لاتدخلوا الجنة حتیٰ تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا (۱)

تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے' جب تک ایمان نہ لاؤ اور ایمان نہیں پا سکتے' جب تک باہم محبت نہ کرو۔

۲. ارجموا من فی الارض یرحکم من فی السماء. (۲)

جو روئے زمین پر ہیں' ان کے ساتھ رحم سے پیش آؤ' جو آسمان پر ہے' وہ تمہارے ساتھ رحم سے پیش آئے گا۔

۳. لایرحم اللہ من لایرحم الناس. (۳)

جو لوگوں کے ساتھ رحم سے پیش نہیں آتا' خدا اس کے ساتھ بھی رحم سے پیش نہ آئے گا۔

اور یہ ارشاد پیش نظر رکھیے:

ایما مسلم کسا مسلماً ثوباً علی عری کساہ اللہ من خضر الجنة وایما مسلم' اطعم مسلماً علیٰ جوع اطعمه اللہ من ثمار الجنة وایما مسلم سقیٰ مسلماً علی ضماء سقاہ اللہ من الرحیق المختوم (۴)

اگر کوئی مسلمان کسی برہنہ مسلمان کو لباس پہنائے گا خدا اسے جنت کی تازگی و آبداری کا لباس پہنائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ایک بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا خدا اسے جنت کے پھل کھلائے گا۔ اگر کوئی مسلمان پیاسے مسلمان کو پانی پلائے گا تو خدا اسے ایسا مشروب پلائے گا جس پر مہر لگی ہوگی۔ یعنی (مشروب جنت)

سب سے آخر میں یہ ارشاد ملاحظہ کیجئے:

لیس المؤمن الذی یشبع وجارہ جائع الیٰ جنبه. (۵)

۱- مسلم بروایت ابوہریرۃؓ ۲- ترمذی' ابوداؤد بروایت عبداللہ بن عمرؓ

۳- بخاری و مسلم بروایت جریر بن عبداللہؓ ۴- ترمذی و ابوداؤد بروایت ابوسعید

۵- بیہقی بروایت ابن عباسؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ شخص صاحب ایمان نہیں کہلا سکتا' جو خود پیٹ بھر کر کھا لے اور اس کے پہلو میں ہمسایہ بھوکا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضورؐ نے صرف انفرادی حیثیت میں خیرات کی تاکید فرمائی۔ حضورؐ نے اجتماعی اعتبار سے بھی باہم امداد اور تعاون پر زور دیا۔ فرمایا:

۱. المؤمنون کرجل واحد ان اشتکی عینه اشتکی کله وان اشتکی راسه اشتکی کله. (۱)

تمام مومن ایک فرد کی طرح ہیں۔ اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہو تو پورے جسم کو تکلیف ہوگی۔ اگر سر درد کرے تو پورا جسم درد میں مبتلا ہوگا۔

۲. تری المؤمنین فی تراحمهم و توادهم وتعاطفهم کمثل الجسد اذا اشتکی عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی. (۲)

مومنوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ باہم محبت' ہمدردی اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح ہیں۔ اگر ایک عضو تکلیف میں ہو تو پورا جسم بے خوابی اور بخار سے تکلیف اٹھاتا ہے۔

یہ اسلام کا نہایت اہم اجتماعی سبق ہے وہ معاشرہ کبھی راحت وقوت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا' جس کے بعض افراد تو انتہائی احتیاج کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے پاس ضرورت سے زیادہ سروسامان جمع رہتا ہے۔ اگر پورا معاشرہ غیر معمولی حالات کے باعث (جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کو پیش آئے تھے) مبتلائے مصائب ہو تو یہ مصائب روحانی قوت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں اور یوں آئندہ عظمت وبرتری کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس کے برعکس اگر قوم کے مہیا وسائل غیر مساوی طریق پر منقسم ہوں۔ بعض گروہوں کو فراوانی حاصل ہو اور قوم کی اکثریت کو قوت لایموت کی خاطر اپنی تمام قوتیں صرف کرنی پڑیں تو افلاس روحانی ترقی کا نہایت خوفناک دشمن بن جاتا ہے اور بعض اوقات یہ صورت حال پوری جماعتوں اور قوموں کو خدا آگاہی سے دور لے جاتی ہے اور وہ اس مادیت کی آغوش میں پہنچ

۱- مسلم بہ روایت نعمان بن بشیر ۲- بخاری ومسلم بہ روایت نعمان بن بشیر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہے' جہاں روح برباد ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ الفاظ فرمائے تو غالباً حضورؐ کے سامنے یہی حقیقت تھی۔ فرمایا:

کاد الفقر ان یکون کفراً (۱)

افلاس بعض اوقات کفر بن جاتا ہے۔

افراط کے عین درمیانی افلاس کا وجود مواخات کے اس اصول کی نفی ہے' جو اسلام کی دعوت کا مبنیٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لایومن عبد حتیٰ یحب لاخیہ مایحب لنفسہ (۲)

اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' کوئی شخص اس وقت تک پورا ایماندار نہیں ہوسکتا' جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کو چاہیے کہ قوم کے اندر حق و انصاف رواج پائے اور ہر شہری ۔۔۔ مرد' عورت اور بچہ ۔۔۔ کے پاس کھانے اور پہننے کے لیے ضروری سامان ہونا چاہیے۔ بیماری میں اس کی امداد کی جائے۔ رہنے کے لیے اس کے پاس موزوں مقام ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے دستور میں چند دفعات اس مضمون کی شائع کر دی جائیں کہ ہر شہری کو حق حاصل ہے:

الف۔ جب تک کام کرنے کی عمر ہو اور صحت اچھی ہو اسے بار آور اور منفعت بخش کام ملے

ب۔ اس بار آور کام کے لیے حسب ضرورت تربیت مملکت کے خرچ پر دی جائے۔

ج۔ بیماری کی حالت میں مفت اور ہر وقت طبی خدمت کا انتظام کیا جائے۔

د۔ اگر کوئی شخص بیماری کے باعث کام کرنے کے قابل نہ رہے یا کوئی عورت بیوہ ہو جائے یا ایسے حالات میں بے روزگاری کا موقع آ جائے' جو انفرادی دسترس سے باہر ہوں' مثلاً بڑھاپا یا کمسنی تو مملکت کھانے پینے پہننے اور رہنے سہنے کا پورا انتظام کر دے۔

ایسے دستوری قانون کا مطلب یہ ہوگا کہ قومی پیمانے پر اجتماعی بیمے کے منصوبے (سوشل

۱۔ سیوطی: الجامع الصغیر ۲۔ بخاری و مسلم بہ روایت انسؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انشورنس سکیم) کا انتظام کیا جائے اور اس منصوبے کے لیے ارباب ثروت پر مناسب محاصل عائد کیے جائیں۔ یہ محاصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے عین مطابق ہوں گے۔ فرمایا:

تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم۔(۱)

(روپیہ) دولت مندوں سے لیا جائے اور غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے۔

اس کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ جائداد پر محصول عائد کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان فی المال حق سواء الزکوٰۃ(۲)

زکوٰۃ کے علاوہ جائداد پر بھی ایک محصول (حق) ہے۔

اگر بعض خوانندگان کتاب کا احساس یہ ہو کہ اجتماعی بیمے کے منصوبے کا خیال بیسویں صدی کی ایجاد ہے تو میں انہیں یہ حقیقت یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ منصوبہ صدیوں پیشتر رائج تھا' البتہ اس نے یہ نام نہیں پایا تھا اور نہ اس کی ضرورت نمایاں ہوئی تھی' جو دور حاضر کے صنعتی تہذیب وتمدن کا اثر ہے۔ یہ منصوبہ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی دولت مشترکہ کے اندر موجود تھا۔ حضرت عمر اعظمؓ نے ۲۰ھ (۶۴۱ء) میں حکومت کا ایک خاص محکمہ قائم کیا تھا' جسے دیوان کہتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً مردم شماری کرائی جائے۔ اسی مردم شماری کی بنا پر مندرجہ ذیل کے لیے مملکت کی طرف سے سالانہ پنشنیں مقرر ہوتی تھیں۔

الف۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے۔

ب۔ وہ تمام افراد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اسلام کے لیے علمدار جہاد رہے' مثلاً ازواج مطہراتؓ شرکائے بدر میں سے باقی ماندہ اصحابؓ ابتدائی مہاجرینؓ وغیرہ۔

ج۔ تمام اپاہج' بیمار اور بوڑھے۔

اس منصوبے کے تحت کم سے کم وظیفہ اڑھائی سو درہم سالانہ تھا۔ پھر ایک باقاعدہ وظیفہ بچوں کے لیے مقرر ہو گیا' جو ان کے والدین یا سرپرستوں کو دیا جاتا (اصول یہ تھا کہ وہ اپنے لیے روزی مہیا نہیں کر سکتے) اور یہ وظیفہ پیدائش سے بلوغ تک برابر جاری رہتا۔ حضرت عمرؓ

۱۔ بخاری بہ روایت عبداللہ بن عباسؓ۔
۲۔ ترمذی وابن ماجہ بہ روایت فاطمہ بنت قیس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے زندگی کے آخری سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا: "اگر خدا نے مجھے زندگی کی مہلت عطا کی تو میں ایسا انتظام کردوں گا کہ صنعا کے پہاڑوں میں تنہا رہنے والا گڈریا بھی قوم کی دولت سے حصہ حاصل کرے"۔(۱)

حضرت عمرؓ ہر معاملے کے عملی پہلوؤں پر خصوصی نظر رکھتے تھے' چنانچہ انہوں نے آدمیوں کی ایک جماعت پر تجربہ شروع کردیا کہ صحت وقوت بحال رکھنے کے لیے آدمی کو بالا وسط کم سے کم کتنی خوراک درکار ہے۔ ان تجربات کے بعد حکم دے دیا کہ مالی وظیفے کے علاوہ ہر مرد اور عورت سرکاری انبار خانوں سے گندم کی ایک مقدر ماہانہ وصول کرے' جس سے یومیہ دو وقت کی خوراک تیار ہو سکے (۲) حضرت عمرؓ اجتماعی بیمے کا یہ عظیم الشان منصوبہ مکمل نہ کر سکے اور آپ نے ایک قاتل کے ہاتھوں شہادت پائی۔ آپ کے جانشینوں میں نہ وہ وسعت نظر تھی اور نہ ویسی انتظامی صلاحیت کہ ان کے نامکمل کام کو جاری رکھتے۔

یہ دیکھئے' اسلامی تاریخ کے بہت سے دوسرے مواقع کی طرح یہاں بھی ایک شاندار آغاز نذر فراموشی ہوگیا۔ اس سے اسلام کو' نیز پیروان اسلام کے عمرانی نشو و ارتقاء کو نقصان پہنچا۔ ہمارے سامنے تیرہ سو سال کا تاریخی تجربہ ہے۔ پھر کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ اس شرمناک تغافل کی تلافی کریں اور حضرت عمرؓ کے شروع کیے ہوئے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان انہ تعالیٰ یقول یوم القیمۃ "یاابن ادم مرضت فلم تعدنی" قال یارب کیف اعودک وانت رب العالمین؟" قال "اما علمت ان عبدی فلان مرض ولم تعدہ؟ اما علمت انک لوعدتہ لوجدتنی عندہ؟" "یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی" قال "یارب کیف اطعمک وانت رب العلمین"؟ قال "اماعلمت انہ' استطعمک عبدی فلان فلن تطعمہ؟ اما علمت انک لو اطعمتہ لوجدت ذلک عندی"؟ یاابن ادم استقیتک فلم تسقنی" قال "یارب کیف اسقیک وانت رب العالمین؟" قال استسقاک عبدی فلان فلم

۱- طبقات ابن سعد جلد ۳ حصہ اول صفحہ ۲۱۳-۲۱۷ ۲- طبقات ابن سعد جلد ۳ حصہ اول صفحہ ۲۱۹-۲۲۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تسقه؟ اما علمت انک لو عتیته وجدت ذالک عندی؟

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہو گیا تو نے میری عیادت نہ کی۔'' آدمی کہے گا ''یا اللہ! میں تیری عیادت کس طرح کرتا؟ تو تو جہانوں کا پروردگار ہے۔'' خدا جواب دے گا ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے بندوں میں سے فلاں اور فلاں بیمار تھے' تو نے ان کی عیادت نہ کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو نے عیادت کی ہوتی تو مجھے بھی بیمار کے پاس پاتا؟ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا' لیکن تو نے نہ دیا۔'' آدمی کہے گا ''یا اللہ! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ تو تو جہانوں کا پروردگار ہے۔'' اس پر خدا فرمائے گا ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے بندوں میں سے فلاں فلاں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے انہیں نہ کھلایا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو انہیں کھانا کھلا دیتا تو مجھے بھی ان کے پاس پاتا''؟ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے نہ پلایا۔'' آدمی کہے گا ''بارالٰہ! میں تجھے پانی کیونکر پلاتا؟ تو تو جہانوں کا پروردگار ہے۔'' خدا فرمائے گا ''میرے فلاں اور فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا' مگر تو نے انہیں پانی نہ پلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو کسی کو پانی پلاتا تو مجھے بھی اس کے پاس پاتا؟''(۱)

۱۔ مسلم بہ روایت ابو ہریرہؓ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب:

مباحث کا ماحصل

راستے کی مشکلات

یہاں ان بنیادی شرعی اصول کے متعلق بحث ختم ہو گئی' جنہیں مملکت کے دستور میں شامل ہونا چاہیے' بشرطیکہ وہ مملکت محض نام کی اسلامی نہ ہو' بلکہ عملاً بھی اسلامی ہو۔

اس کتاب میں میری کوشش یہ نہ تھی کہ کسی مملکت کا دستور پیش کر دیتا۔ میں نے اسلام کے بعض بدیہی احکام پیش کرنے کی کوشش کی' جو کسی مملکت اور حکومت کے مسائل کے متعلق ہیں۔ دور حاضر کی ضروریات کے مطابق ان پر عمل کے طریقے بحث میں آئے اور ان قانونی انتظامات کی طرف توجہ دلائی' جنہیں بہر حال اس دستور میں شامل ہونا چاہیے' جو اسلامی ہونے کا مدعی ہو۔ کتاب کی محدود گنجائش کے باوجود میں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام نے ہمارے سامنے اپنا واضح اور قطعی سیاسی قانون پیش کر دیا ہے اور تفصیلات کا معاملہ وقتی احوال کے مطابق اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی مملکت کی تنظیم میں جو طور طریقے اور کاروائیاں مضمر ہیں' ان پر محض بحث اسلام کے پورے منصوبے کی حقیقی حیثیت واضح نہیں کر سکتی' کیونکہ اسلام محض سیاست یا عمل کا پروگرام نہیں' بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہ عقائد' اخلاق اور عمرانی اصول کا نظام ہے۔ تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راستبازی کی دعوت ہے۔ یہ ایک مکمل اور کفیل بالذات نظریہ ہے' جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے' خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جسمانی' روحانی ہوں یا ذہنی' انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ سب پہلو ایک غیر منقسم کل کے اجزا ہیں' جسے ہم انسانی زندگی کہتے ہیں۔ چونکہ اسلامی نظریہ بجائے خود مکمل وکفیل بالذات ہے' لہٰذا اس کے پیرو محض اسلامی عقائد کی بنا پر حقیقی اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ انہیں بہت کچھ کرنا چاہیے۔ اگر اسلام کا اسم با مسمٰی بننا ضروری ہے تو انہیں چاہیے کہ جن عقائد کے وہ مدعی ہیں' انہیں کے مطابق عمرانی روش رکھیں۔ ایسی اجتماعی روش اور کوشش اس وقت تک ممکن نہیں' جب

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک پوری قوم اسلام کے عمرانی ومملکت کے نظام ہی میں ۔۔۔ جو اسلامی اصول پر مبنی ہو اور اس میں حکمرانی' قانون سازی اور تنفیذ قوانین کا پورا انتظام ہو ۔۔ اسلامی مقاصد بار آور عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس میں زیادہ تر قومی تصورات کو غلبہ حاصل ہے۔ ان کی حیثیت یا تو نسلی ہے یا زیادہ سے زیادہ خالص ثقافتی۔ ایسی دنیا میں اسلامی مملکت کا تصور اس سے دور افتادہ ہے' جسے باقی دنیا دورِ حاضر کی چیز یا مطلوب سمجھتی ہے۔ جب مذہبی نظریے کی بنا پر تعمیر مملکت کی وکالت کی جائے گی تو یقیناً سخت مخالفت سے سابقہ پڑے گا' ہمارے عہد کی اکثر قومیں نسلی رشتوں یا تاریخی روایتوں ہی کو قومیت کے جائز مقدمات قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ اس کے برعکس ہم مسلمان ایک نظریاتی جمعیت ۔۔۔ ایسے افراد کی جمعیت جو زندگی کے متعلق قطعی نقطۂ نگاہ اور اخلاقی اقدار کے متعلق ایک قطعی معیار میں مشترک ہیں ۔۔۔ کو قومیت کی اعلیٰ ترین شکل سمجھتے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ محض اس بنا پر نہیں کرتے کہ ہمیں اپنے خاص نظریے یعنی اسلام کی حقانیت کا یقین ہے' جو خدا کی طرف سے بہ صورت قانون ہمیں عطا ہوا' بلکہ ہماری عقل بھی یہی کہتی ہے کہ مشترک افکار کی بنا پر قائم شدہ جمعیت اس جمعیت کے مقابلے میں انسانی زندگی کا بدرجہا ترقی یافتہ مظہر ہے' جو نسل یا زبان یا جغرافیائی موقع ومحل پر مبنی ہو۔

اگر ہم اپنے نظام سیاست کو اسلامی اوضاع ومقاصد کے مطابق بنانے کا فیصلہ کر لیں تو جن مشکلات سے سابقہ پڑے گا' انہیں معمولی نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صدیوں کی تذلیل وبے قدری اور محکومی نے ملت اسلامیہ کی قوت سلب کر لی اور اس کی اجتماعی حوصلہ مندی میں ضعف آ گیا ہے۔ ایسے حالات میں حقیقی اسلامی نظام سیاست کا قیام آسان کام نہیں۔ مسلمانوں نے سیاسی انحطاط کے دوران میں ثقافتی خود اعتمادی کا بھی بڑا حصہ زائل کر دیا۔ بہت سے مسلمانوں کو یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ وہ آج غور وفکر کرتے وقت ''مملکت'' اور ''قومیت'' کی مغربی اصطلاحات سے الگ نہیں رہ سکتے اور اسلامی اصطلاحات سے کام نہیں لے سکتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے فکر کے مغربی نمونوں کی پیروی کر رہے ہیں اور سادہ لوحی سے سمجھتے ہیں کہ مغرب سے جو بھی چیز آتی ہے' وہی مسلمانوں کی پیدا کردہ کسی چیز کے مقابلے میں تازہ ترین ہونا چاہیے۔ ان کا یہی یقین اس امر کا باعث ہے کہ اپنے معاشرے میں جو کچھ پیش

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آتا ہے' اس پر غیر ذمہ دارانہ انداز میں مغربی سیاسی تصورات سے کام لیتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس بہت سے قدامت پسند مسلمان ہیں' جو قولاً اور عملاً روایتی اوضاع قائم رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے قوم کی مغربیت مآبی کے مخالف ہیں۔ ان کی مخالفت اسلام کی حقیقی اقدار کے صحیح اندازے پر مبنی نہیں' بلکہ اس کی بنا ان عمرانی معمولات پر ہے' جو ہمارے دور انحطاط میں بروئے کار آئے۔ وہ غالباً فرض کیے بیٹھے ہیں کہ اسلام اور مسلم معاشرے کے معمولات ایک شے ہیں (حالانکہ ہر صاحب فکر پر واضح ہے کہ یہ مفروضہ سر تا سر غلط ہے) لہٰذا جس حد تک ان معمولات سے اختلاف کیا جائے گا' جو ہماری تاریخ کے دوران میں بروئے کار آئے۔۔۔ وہ معمولات بھی' جن کا تعلق عمرانی عادات سے ہے اور وہ بھی' جو مسائل مملکت و حکومت کے باب میں ہمارے نقطہء نگاہ سے متعلق ہیں۔۔۔ وہ اسلام کے خلاف ہوگا۔ گویا اسلامی مملکت کا فرض یہ ہے کہ ان تمام عمرانی اوضاع کی قانونی توثیق کرے اور انہیں صورت دوام دے دے' جن میں ہم اب تک زندگی بسر کرتے آئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے معاشرے کے ان قدامت پسند عناصر نے فرض کر رکھا ہے کہ اسلام کی بقا ان احوال کے قیام پر موقوف ہے' جنہوں نے اپنی بے ثمر صلابت کے باعث مسلمانوں کے لیے حقیقی اسلامی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنا اب ناممکن بنا رکھا ہے۔ خوانندہء کتاب کو اس اعتراف میں تأمل نہ ہوگا کہ یہ بڑی ہی افسوسناک منطق ہے' لیکن یہ مفروضات کتنے ہی مہمل کیوں نہ ہوں' ان سے وہ بنیاد ضرور واضح ہو جاتی ہے' جس پر قدامت پسند نکتہ چینوں کے قلوب کارفرما ہیں۔ وہ ہمارے عمرانی تصورات و عادات میں کسی بھی تغیر کی ضرورت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اور بے شمار مسلمانوں' مردوں اور عورتوں کو یہ حالت بے چارگی مغرب کی نقالی پر مجبور کر رہی ہے۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ دور حاضر کی اسلامی مملکت ہمارے ماضی کے تاریخی نمونوں کا ہو بہو چربہ ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے اغلب ہے اسلامی مملکت کا نظریہ ہی بے حرمتی اور استہزاء کا ہدف بن جائے۔

خود ہمارے ثقافتی انحطاط اور اسلامی فکر میں صدیوں کے جمود سے جو مشکلات پیدا ہوئیں' انہیں ایک طرف رکھیے۔ جب ہم اپنے وطنوں کو صحیح اسلامی اصول پر منظم کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو غیر مسلم دنیا میں لامحالہ ایک خوف پیدا ہو جاتا ہے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر قسم کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں تاکہ ہم اس نصب العین کی طرف گام زن نہ ہو سکیں۔ حروب صلیبیہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے زمانے سے اسلام کو اہل مغرب کے روبرو غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور ہر اسلامی معاملے کے متعلق گہری بے اعتمادی ـــ تقریباً نفرت ـــ مغرب کی ثقافتی میراث کا غیر منفک جزو بن گئی ہے۔ اہل مغرب کو اسلامی اصول میں ان کے اکثر بنیادی مذہبی عقائد کا روحی پریشان نہیں کرتا' بلکہ وہ اسلام کو سیاسی خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔ اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان صدیوں تک شدید رزم و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ ان تاریخی یادوں کے زیر اثر وہ اسلام پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ اس مذہب میں تمام غیر مسلموں سے عداوت مضمر ہے اور انہیں یہ خوف دامنگیر ہے کہ اسلامی مملکت کے خیال میں اسلامی روح کا احیاء شامل ہے اور ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں اور وہ دوبارہ مغرب کی طرف نئے جارحانہ اقدامات شروع کر دیں۔ اس ممکن رجحان کے سدباب کی غرض سے اہل مغرب وہ سب کچھ کر رہے ہیں' جو اسلامی ملکوں کی سیاسی قوت کے احیاء کی روک تھام کے لیے ضروری ہے اور جس کی وجہ سے اسلام کو دوبارہ مسلمانوں کی عمرانی و ذہنی زندگی میں مقتدر حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے وسائل مقابلہ محض سیاسی نہیں' ثقافتی بھی ہیں۔ مغربی درسگاہوں کے ذریعے سے' نیز اسلامی دنیا میں مغربیوں کے جاری کردہ طریق تعلیم کے ذریعے سے اسلام کے خلاف بے اعتمادی پیدا کی جا رہی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی نئی نسل کے دلوں میں منظم طریق پر یہ بٹھایا جا رہا ہے کہ اسلام کے عمرانی اصول قابل اعتماد نہیں۔ اسلام کے خلاف بے اعتمادی کی مہم میں سب سے بڑا حربہ نادانستہ ہمارے معاشرے کے قدامت پسند عناصر مہیا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ معاصر اسلامی مملکت کے سیاسی اوضاع اور وسائل کاروبار وہی ہونے چاہئیں' جن کا نمونہ ابتدائی اسلامی دور میں بروئے کار آیا (حالانکہ قرآن وسنت میں اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام حق لے کر اس دنیا میں آئے' اس کے یہ خود ساختہ محافظ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے وقت کے سیاسی تقاضوں کے مطابق شریعت کو نظام کی شکل میں قبول کر لینا ناممکن بنا رہے ہیں۔ یہ جہاد کو غیر مسلم علاقوں میں مملکت کی جارحانہ توسیع کا حربہ ظاہر کر رہے ہیں۔ یوں اس مقدس فریضے کو ایسی شکل دے رہے ہیں' جس سے تمام قرآنی احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ غیر مسلموں کے دل میں خوف کا بیج بوتے ہیں اور بہت سے راستباز مسلمانوں کے دل میں اس رجحان کی بے انصافی پر بیزاری رونما ہوتی ہے۔ آخر میں ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے اندر زندگی کے تمام

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجتماعی پہلوؤں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز کا فرض عائد کرتی ہے (حالانکہ اس کے لیے بھی قرآن وسنت میں کوئی سند موجود نہیں) گویا غیر مسلم اقلیتوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے اور ان اقلیتوں کے لیے یہ خیال اطمینان سے برداشت کر لینا ناممکن بنایا جاتا ہے کہ جس ملک میں وہ مقیم ہیں' وہ اسلامی ملک بن جائے۔

اس خطرے پر جو غیر مسلم دنیا کو عموماً اور ہمارے غیر مسلم شہریوں کو خصوصاً درپیش ہے' قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے عمرانی وسیاسی منصوبے کی توضیح کر سکیں اور بتا سکیں کہ اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے حق وانصاف ہے اور حقیقی اسلامی مملکت کے قیام کے لیے ہمارے محرک صرف اخلاقی مصالح ہیں۔ خیر ہمارا فرض ہے کہ پوری دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم حقیقتہً قرآن کے ان مقدس الفاظ کا عملی پیکر بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

كنتم خير امت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله.(۱)

تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو' جو لوگوں (کے ارشاد واصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے' برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

ہمارے راستباز قوم ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ہمیشہ اور تمام حالات میں حق و انصاف کی پاس داری کے لیے جدوجہد پر آمادہ رہیں اور تمام قوموں کے لیے ناحق اور بے انصافی موقوف کرا دیں۔ محض اسی سے واضح ہو سکتا ہے کہ حقیقی ملت اسلامیہ اپنے درمیان رہنے والے غیر مسلموں کے لیے کبھی بے انصافی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔

ہمارے سامنے جو دوسری مشکل ہے ۔۔۔ جو اسلامی مملکت کی نوعیت وطرز عمل کے متعلق قدامت پسند مسلمانوں کے متعصبانہ اور رسم پرستانہ آراء سے پیدا ہوئی ۔۔۔ اس پر قابو پانے کی صرف یہ صورت ہے کہ ہم قرآن وسنت میں پیش کردہ سیاسی قانون کے مسئلے پر تخلیقی انداز سے غور کریں اور تمام تاریخی نمونوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ ساتھ ہی ان تمام تعبیرات سے دستکش ہو جائیں' جو ہمیں سابقہ نسلوں سے ملیں بہ الفاظ دیگر ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ ہتا

۱۔ سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۱۰۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکیں' قدامت پسندوں کے تمام اعتراضات کے علی الرغم قانون اسلام فقہی موشگافیوں یا خطبات جمعہ کی عبارت آرائیوں ہی کا موضوع نہیں' بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک زندہ اور حرکی پروگرام ہے' ایسا پروگرام جو اپنی جگہ کامل واکمل ہے۔ وہ ہر خاص ماحول سے بالکل بے نیاز ہے' لہٰذا تمام اوقات اور تمام احوال میں قابل عمل ہے۔ یہ پروگرام ایسا ہے کہ اس پر عمل پیرائی سے نہ محض ہمارے معاشرے کے نشوو ارتقاء میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی' بلکہ یہ ہمارے معاشرے کو زیادہ سے زیادہ ترقی پذیر' زیادہ سے زیادہ کفیل بالذات اور تمام موجود معاشروں میں حد درجہ زبردست اور قوی بنا دے گا۔

مجموعہ قوانین کی ضرورت

اسلامی مملکت کے اصول کی یہ بحث ختم کرنے سے پیشتر میں چند الفاظ مجموعہ قوانین اسلامی کی ضرورت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

ہم دیکھ چکے ہیں' اسلامی مملکت کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے زیر اقتدار علاقوں میں شریعت کے احکام نافذ کرے اور اس غرض سے ہمیں قوانین شریعت کے ایک ایسے مجموعے کی ضرورت ہے' جو مختصر اور واضح طور پر جامع ہو' لیکن ایسے مجموعے کے لیے سامان کہاں سے ملے گا؟ اس کا بدیہی جواب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے نصوص میں۔ مگر کیا احکام نصوص کبھی پورے کے پورے جمع کر کے موشگافانہ رسمی فقہ کے قیاسی اضافے کے بغیر ملت اسلامیہ کے سامنے پیش کیے گئے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے' اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسلامی قانون کو حقیقی' سادہ اور بہ آسانی قابل فہم شکل میں پیش کرنے کے بجائے مسلمانوں کے سامنے فقہی استخراجات و تعبیرات کا ایک عظیم الشان اور ذو اطراف ذخیرہ پیش کیا جاتا ہے' جو مختلف علماء اور دبستان ہائے فکر نے ایک ہزار سال پیشتر ترتیب دیا' لیکن استخراجات وتعبیرات نہ محض تعداد ہی میں زیادہ ہیں' بلکہ حد درجہ پیچیدہ بھی ہیں اور اکثر نہایت اہم قانونی نکات میں باہم دگر متناقض ہیں۔ مثلاً اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور مسلمانوں کو اجتماعی دسیاسی معاملات میں کیسی روش اختیار کرنی چاہیے' اس قسم کے امور کے متعلق سنی فقہ میں سے حنفی دبستان' اثنا عشری شیعوں اور صوفیوں کے نظریات میں ہم آہنگی نہیں۔ بہت سے کم تر درجے کے دبستان ہائے فقہ کا ذکر ہی کیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف فقہی نظاموں میں سے اسلامی مملکت کے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون عامہ کا مجموعہ ترتیب دینے کی غرض سے کس نظریے کو بنیاد بنانا چاہیے؟

کہا جاسکتا ہے کہ ہر اسلامی ملک میں اس غرض سے وہ فقہی تعلیمات استعمال کرنی چاہئیں' جنکی پابند آبادی کی اکثریت ہے' یعنی جہاں حنفیوں کی اکثریت ہے' حنفی فقہ قانون عامہ کی بنیاد ہو' جس ملک میں شیعوں کی اکثریت ہے' وہاں جعفری فقہ کو بنیاد مانا جائے وقس علیٰ ھذا۔ لیکن اس طرز عمل کے خلاف کم از کم دو اعتراض بڑے وزنی ہیں: اول مروجہ فقہی نظاموں میں سے کوئی بھی موجودہ وقت کی ضروریات کے مطابق نہیں' کیونکہ استخراجات بڑی حد تک اس زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں' جو ہمارے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔ دوم یہ ناقابل تصور ہے کہ جو مملکت اسلامی ہونے کی مدعی ہے' وہاں وہ فقہ رائج ہو' جو آبادی کے صرف ایک حصے کے نزدیک قابل قبول ہو (اگرچہ وہ حصہ بہ لحاظ تعداد اکثریت کا حامل ہو) اور یہ فقہ قوم کی اقلیت پر اس کی مرضی کے خلاف عائد کی جائے۔ یوں اسے سیاسی اعتبار سے بھی اقلیت بنا دیا جائے۔ اس قسم کی من مانی کارروائی قرآن کے اصول مواخات اور تمام مسلمانوں کی مساوات کے صریح خلاف ہوگی' لہٰذا اسلامی مملکت کے پاس شرعی احکام کا ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہیے۔

الف۔ جو تمام مسلمان شہریوں کے نزدیک فی الجملہ قابل قبول ہو اور فقہی دبستانوں سے ان کے تعلق کوئی امتیاز پیش نظر نہ رکھا جائے۔[1]

ب۔ جس سے الٰہی قانون کی دائمی اور غیر متبدل خصوصیت اس شان سے واضح ہو جائے کہ اس کا اطلاق تمام زمانوں اور انسان کے اجتماعی و ذہنی نشوو ارتقاء کے تمام مرحلوں پر کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ اسلامی دنیا میں اس دوگونہ کام کی ضرورت جس تیزی سے محسوس کی جارہی ہے' وہ محتاج بیان نہیں۔ اکثر تجویزیں پیش کی جاتی ہیں کہ مروجہ فقہی دبستان ہائے فکر کی تعلیمات میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ نیز دور حاضر کے فکر اور زندگی کے موجودہ حالات کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ایسی کوشش نہ محض اصل مقصد کے خلاف جائے گی' بلکہ مسائل شریعت کے متعلق مسلمانوں کی روش کے سلسلے میں نہایت افسوس ناک حالات پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اول: ''مختلف دبستان ہائے فقہ اسلامی میں ہم آہنگی'' بظاہر کتنی ہی مطلوب ہو' وہ

---

[1] دیکھئے اس کتاب کا تیسرا باب زیر عنوان ''اصول رہنمائی''

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجموعہ قوانین مطلقاً پیدا نہیں کر سکتی' جو بالکل سادہ ہو اور فکر سلیم رکھنے والا ہر مسلمان اسے سمجھ سکے' خواہ اس نے قانونی امور میں درجہ تخصیص حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ہم آہنگی کا مطلب یہ ہوگا کہ ان حد درجہ قیاسی اور بے شمار استخراجات میں (جن سے تمام دبستانوں کی مروجہ فقہ مرکب ہے) مصنوعی لحاظ سے ارتباط پیدا کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیاسی فقہ کا نظام پیچیدہ تر ہو جائے گا۔

دوم۔ اس قسم کی ہر ہم آہنگی اور ارتباط سے وہ پریشانی مستقل حیثیت اختیار کر لے گی' جو بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں موجود ہے۔ پریشانی یہ کہ خدا اور اس کے رسول نے کیا حکم دیا تھا (دوسرے لفظوں میں قانون دینے والے نے قرآن وسنت میں کون سے نصوص رکھے تھے) اور اس قانون کے متعلق مسلمان علماء کی رائے نسلاً بعد نسل کیا رہی۔ یوں ہمارا شرعی تصور پھر اس فکر کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا' جو تاریخ کے ایک خاص دور --- انسانوں کے درمیان خاص وقت پر --- میں رائج تھا۔

سوم۔ اگر موجودہ حالات کی روشنی میں شریعت پر ''نظر ثانی'' کی کوشش کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوام وثبات کا وہ آخری رشتہ بھی ختم ہو جائے گا' جو مسلمانوں کے نزدیک وجداناً۔ اور بالکل بجا --- قانون الٰہی کے تصور سے وابستہ ہے' کیونکہ اگر نظر ثانی اب ضروری ہے تو چند قرن گزر جانے کے بعد پھر ضروری ہو جائے گی' کیونکہ ''موجودہ حالات'' بدل جائیں گے۔ یہ سلسلہ متواتر اسی طرح جاری رہے گا' یہاں تک کہ قانون اسلام نظر ثانی ہی کے تواتر سے ناپید ہو جائے گا۔ اگر اسے حق بجانب سمجھا جائے تو ہمیں یہ دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے کہ قانون دینے والے نے قانون اسلام کو دوامی اور ابدی قرار دیا تھا؟ کیا اس طرز عمل کو درست سمجھنے کے بجائے صاف صاف یہ کہہ دینا مناسب نہ ہوگا کہ قانون اسلام' حالات پیدا کرنے کے بجائے ان کے تابع ہے' لہٰذا اسے الٰہی قانون نہیں کہا جا سکتا؟

ایسی شکست خوردہ روش ہماری ذہنی ابتری اور پریشانی ختم نہیں کر سکتی۔ یہ ابتری و پریشانی الٰہی قانون کی دوامی اور غیر متبدل خصوصیت کو ترک کر دینے سے دور نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس ہم اس دوامی اور غیر متبدل خصوصیت کو اس وقت تک کامیابی سے قائم نہیں رکھ سکتے' جب تک حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اور رسمی وابستگیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے خدا کی اصل شریعت کو انسان کے ساختہ پرداختہ استخراجی فقہی قوانین سے الگ نہ کر دیں۔ یعنی اسلامی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون کو ابتدائی حدود و دائرہ عمل کے اندر لے آئیں۔ قرآن و سنت کے سادہ، واضح اور غیر مشتبہ احکام سامنے رکھ لیں۔ اسلامی نظریے کو از سر نو سمجھنے کی یہی ایک صورت ہے۔ اسی طرح مسلمان ثقافتی جمود و انحطاط پر قابو پا سکتے ہیں اور اس مکروہ غیر ارادیت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، جو اب مذہبی فکر پر غالب ہے۔ اسی طرح شریعت ایک اسلامی مملکت میں ایک زندہ شے بن سکتی ہے۔

مجموعہ کیوں کر مرتب کیا جائے؟

جو اسلامی ملت احکام اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے عمرانی و اقتصادی پروگرام کو سیاسی عمل کی شکل دے دے، اس کے لیے پہلا قدم یہی ہوگا کہ ان نصوص قرآن و سنت کا ایک مجموعہ مرتب کرے، جن میں عوام سے تعلق رکھنے والے مسائل کے متعلق واضح اور روشن قوانین موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی مملکت کے لیے طریق عمل میرے نزدیک مندرجہ ذیل خطوط کے مطابق ہونا چاہیے۔

۱۔ مجلس شوریٰ علماء کی ایک مختصر سی جماعت منتخب کرے جس میں مختلف دبستان ہائے فقہ کی نمائندگی کا انتظام ہو۔ اس کے ارکان قرآن کی تاریخ اور طریق ومنہاج نیز علم حدیث سے پوری طرح واقف ہوں اور مجموعے کی ترتیب کا کام انہیں سونپ دیا جائے۔ ان کا فرض ہوگا، قرآن وسنت کے صرف ایسے احکام پر متوجہ ہوں، جو

الف۔ نص کی لسانی تعریف کے عین مطابق ہوں یعنی ایسے احکام و بیانات، جو ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک مخصوص مفہوم کے حامل ہوں اور ان کی ایک سے زیادہ تعبیر نہ ہو سکے۔

ب۔ ان کی حیثیت واضح طور پر امر یا نہی کی ہو۔

ج۔ ان کا تعلق براہ راست انسان کے اجتماعی چلن اور عمل سے ہو۔

۲۔ قرآن مجید سے نصی احکام کا انتخاب مقابلۃً سہل ہے، کیوں کہ ایک ہی متن زیر غور ہوگا، لیکن جب اس اصول کا اطلاق احادیث پر کیا جائے گا تو ہر حدیث کا پورا جائزہ اس کے مناسب تاریخی پس منظر میں لینا ضروری ہوگا۔ صرف وہی احادیث زیر غور لانی چاہئیں، جو تاریخی اور فنی نکتہ چینی کے اعلیٰ معیار پر پوری اتر چکی ہوں۔ جن احادیث کی صحت پر معمولی سی گنجائش اعتراض بھی موجود ہو انہیں ابتدا ہی میں الگ کر دینا چاہیے (اس کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطلب یہ نہیں کہ جو احادیث فنی نقطۂ نگاہ سے کسی حد تک مجروح ہیں اور باقی اعتبارات سے ان میں صحت کے تمام علائم موجود ہیں' انہیں وقتاً فوقتاً اجتہادی غرض سے استعمال نہ کیا جائے۔ میں اس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں کہ زیر بحث شرعی مجموعہ قوانین کے متن میں ایسی احادیث شامل نہ کی جائیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام تمام حالات اور تمام اوقات کے لیے مقرر فرمائے۔ بعض احکام خاص موقع اور وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دیے گئے تھے۔ ان میں امتیاز قائم رکھنا چاہیے۔ یہ آخری قسم کے احکام یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہی سے واضح ہو جاتے ہیں یا ان صحابہ نے ان کے ساتھ توضیحات لگا دیں' جو متعلقہ احادیث کے راوی تھے۔ بعض اوقات کسی حکم کی موقت حیثیت دوسری احادیث سے واضح ہو جاتی ہے' جو اسی موضوع کے متعلق آئی ہیں۔ جب کوئی تصریح وتوضیح نہ مل سکے تو اس حکم نص کو' جو صحیح احادیث میں آچکا ہے دائمی صحت وتوثیق کا حامل سمجھنا چاہیے۔

۲۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شرعی قانون قائم کرنے کے لیے ہمیں قرآنی آیات کے مختلف ٹکڑے یا متفرق احادیث چن لینے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے' بلکہ ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پورا سیاق پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت بجائے خود کوئی قانونی حکم پیش نہیں کرتی' تاہم اگر اسے کسی دوسری آیت یا صحیح حدیث سے ملا کر دیکھا جائے تو قانون کی نص بن جاتی ہے۔ عموماً یہی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی ہے۔ ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت کے امام اور قانون ساز کی حیثیت میں جو کچھ فرمایا موجودہ احادیث میں سے اکثر حضور کے ارشادات کے محض بعض حصے یا متفرق واقعات بیان کرتی ہیں' جنہیں تاریخی پس منظر سے الگ کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا حضورؐ کی طرف سے جو قانونی احکام جاری ہوئے' وہ بعض اوقات اس وقت واضح ہوتے ہیں' جب متعدد صحیح احادیث پہلو بہ پہلو رکھی جاتی ہیں یا متعلقہ احادیث کو کسی ہم معنی قرآنی آیات سے ملا کر پڑھا جاتا ہے۔ بہ ہر حال یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ قرآن وسنت ایک لاینفک کل ہیں' جو ایک دوسرے کی توضیح وتفسیر کرتے ہیں۔ لہٰذا مجوزہ شرعی ضابطہ ترتیب دیتے وقت دونوں یعنی قرآن وسنت کا پورا متن سامنے رہنا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ قرآن وسنت سے جو فقہی احکام واضح ہوں' انہیں خاص عنوانوں کے تحت مرتب کر لینا چاہیے' جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی وسیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہو۔ پھر اس مجموعے کو دنیائے اسلام کے مستند فضلا کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ بھی ان پر تبصرہ کریں اور کوئی چیز رہ گئی ہو تو تجویز کر دیں۔ خصوصیت سے اس طریقے پر تبصرہ ضروری ہے' جس کے مطابق احادیث پر مبنی احکام لیے گئے ہیں۔ اس حقیقت پر زور دینا چاہیے کہ اس طرح قرآن وسنت کو نصی احکام کی شکل دینا مقصود نہیں اور واضح کر دیا جائے کہ اس مجموعے کی ترتیب کا مقصد وہ احکام پیش نظر لانا ہے' جو اپنی ظاہر حیثیت کی بنا پر متناقض تعبیرات کا موضوع نہیں بن سکتے۔ اس بنا پر انہیں مختلف دبستان ہائے فقہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ قدر مشترک کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ قرآن وسنت کے جن بیانات کی تعبیر ایک سے زیادہ طریقے پر کی جا سکے (مجموعہ مرتب کرنے والی کمیٹی کو بتا دیا جائے' انہیں مجموعے سے باہر رکھنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ مجموعہ تمام مسلمان قبول کر لیں گے' خواہ ان کا تعلق کسی فقہی دبستاں سے ہو نیز قانون عامہ کا ایک ایسا مجموعہ مرتب ہو جائے گا' جو حجم میں کم' حد درجہ مختصر اور اوسط درجے کی عقل وتعلیم کے ہر مسلمان مرد وزن کے لیے قابل فہم ہو گا۔

۵۔ جن علماء کے پاس شرعی قوانین کا یہ مجموعہ بھیجا جائے گا' اس پر نقد وتبصرہ اور تجاویز کو ان کی حقیقی حیثیت کے اعتبار سے سوچا جائے گا اور آخری نظر ثانی میں ان سے کام لیا جائے گا۔ پھر اسے ملک کے بنیادی قوانین کی حیثیت میں اختیار کر لینے کی تجویز کے ساتھ مجلس شوریٰ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اگر ہم شریعت کے اجتماعی احکام تجویز کردہ خطوط کے مطابق مرتب کر لیں تو اسلام کا سیاسی نظریہ (سیاسی کو وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے) اس وضاحت سے سامنے آ جائے گا' جس میں یہ کبھی نہ آیا۔ اس کی تمام دفعات متعین معانی کی حامل ہوں گی' جن میں متناقض تعبیرات کے لیے کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ ہر مسلمان پر واضح ہو جائے گا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں اسے شرعی قانون کی حاکمیت بے چون وچرا تسلیم کر لینی چاہیے۔ اہل علم کے اجتہاد کی گنجائش ختم نہ ہو گی' بلکہ اس کی ضرورت بہت بڑھ جائے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے' حقیقی شریعت (مجموعہ نصوص قرآن وسنت) کا مدعا کبھی یہ نہ تھا کہ ہماری زندگیوں کے ہر ممکن واقعے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے متعلق ہر تفصیل بتا دی جائے۔ یہ محض ایک خاکہ تھا اور ہمیں اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لے کر اس کی روشنی میں اپنے یومیہ معاملات ترتیب دینے چاہئیں۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ خود ہمارے آزاد استدلال کی کارفرمائی کے لیے کتنا وسیع میدان موجود ہے۔ اجتہادی فکرو نظر کے مختلف نتائج میں اختلاف ضرور ہو گا' لیکن اس سے کیوں گھبرائیں؟ جب ایک مرتبہ اجتماعی وسیاسی قوانین شریعت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی غیر متبدل بنیاد واساس کے طور پر قائم ہو جائیں گے تو تمام غیر شرعی معاملات کے متعلق ہمارے آراء کا اختلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غیر فانی ارشاد کے تابع چلا جائے گا' جو میں اس کتاب میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔

اختلاف علماء امتی رحمة.

میری امت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت کا نشان ہے۔

بہ حالت موجودہ کوئی صاحب عقل وہوش ان اختلافات وتنازعات آراء کو رحمت باری تعالیٰ کی شہادت قرار نہیں دے سکتا' جس نے موجودہ دنیائے اسلام کو انسانیت کا ایک غیر متشکل' غیر منضبط ور ثقافتی اعتبار سے بے ثمر' ہجوم بنا رکھا ہے۔ ان میں اس مسئلے پر کوئی بنیادی اتفاق نہیں کہ اسلام کے اجتماعی وسیاسی قانون کا مفہوم کیا ہے۔ جھگڑے اور آراء کا یہ اختلاف ہماری تخلیقی قوتوں میں اضافہ نہیں کرتا' بلکہ اس سے ہمارے شکوک' ہماری مایوسی' ہماری ثقافتی شکست خوردگی' نیز اپنے متعلق اپنی نظریاتی میراث کے متعلق بیزاری بڑھتی ہے۔ ان حالات میں اس وقت تک کوئی خوش گوار تغیر نہیں پیدا ہو سکتا اور یہ صورت حالات رفتہ رفتہ اسلام سے ایک عملی مسلک کی حیثیت میں گریز کی طرف لے جا رہی ہے اور آخر ہماری ثقافت درہم برہم ہو جائے گی۔۔۔۔ جب تک ہم شریعت کے اجتماعی وسیاسی قوانین کا مجموعہ مرتب کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے' مدت سے فراموش کردہ اس کام پر توجہ نہ کریں گے اور اسے اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد نہ بنائیں گے۔ جب تک یہ نہ ہو گا' مسلمان ان اجتماعی طور طریقوں کے متعلق حد درجہ متخالف نظریات پر قائم رہیں گے' جن کے مطابق کاربند ہو کر اسلام کے فروغ پانے کی امید ہے۔ یہاں تک کہ آخر فروغ وترقی کے متعلق ہمارے تمام افکار اسلام سے کاملاً الگ ہو جائیں گے۔

کیا ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ یہ صورت حال پیش آئے؟ یا کیا ہماری خواہش یہ ہے کہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے آپ پر اور باقی دنیا پر واضح کر دیں کہ اسلام ہمیشہ کے لیے ایک عملی دین ہے' لہٰذا یہ ہمارے عہد کے لیے بھی عملی ہے؟

نظریہ اسلام کو عملی یا غیر عملی ثابت کرنا ہم مسلمانوں کا کام ہے۔ اگر ہم دور ماضی کے فقہی قیاسات تک اسلامی تصور کا دائرہ محدود رکھیں تو یہ بالکل غیر عملی رہے گا۔ اگر ہم حوصلے اور فکر و نظر سے کام لیتے ہوئے اس پر متوجہ ہوں' تازہ اور بے میل نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہوئے رسمی فقہی قیاسات کے دائرے سے اسے باہر نکال لیں تو اس کی عملیت معاً روز روشن کی طرح نمایاں ہو جائے گی۔ یقیناً یہ بدیع نقطہ نگاہ ہم میں سے اکثر کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے' کیونکہ اکثر طرق فکر سے واضح انقطاع اختیار کرنا لازم ہوگا اور یہ طرق فکر مدت سے مسلمانوں کی عادت ثانیہ چلے آتے ہیں۔ جو اجتماعی مراسم صدیوں کے عمل سے تقدس کا درجہ حاصل کر چکے ہیں' انہیں ترک کرنا پڑے گا۔ اس خوش اعتقادی سے بھی دست کش ہونا پڑے گا کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام اصول و فروع مستند اور قطعی طور پر فلاں یا فلاں کتاب فقہ میں بتا دیئے جا چکے ہیں۔ غرض اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان نئے مراکز کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی' جنہیں ابھی تک ہمارے نقشے پر جگہ نہیں ملی۔ یہ صورت حال زیادہ قدامت پسندوں کے لیے ہراس انگیز ہے اور اس مقصد کے لیے جو بھی کوشش کی جائے گی' اسے لاریب شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ مخالفت خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کی طرف سے ہوگی' جو زمانہ ماضی کے بڑے بڑے فقہا کے آراء پر بے چون و چرا اعتماد کو اپنا مسلک مشرب و مسلک بنائے بیٹھے ہیں۔ اس ''خیر'' کا انحصار ذہنی اور اجتماعی معاملات میں ان کی اپنی بے عملی اور بزدلی پر ہے' لیکن اگر ہمارے دل میں اسلام اور صرف اسلام کے غلبے کا صحیح جذبہ موجود ہے تو ہمیں کسی مخالفت کو عناں گیر ہونے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمعیۃ پبلی کیشنز کی مطبوعات

	نام کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱-	سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہؐ	مولانا سید محمد میاںؒ	824	250روپے
۲-	صحابہ کرام کا عہد زریں	مولانا سید محمد میاںؒ	752	300روپے
۳-	اسیران مالٹا	مولانا سید محمد میاںؒ	392	160روپے
۴-	تحریک ریشمی رومال	مولانا سید محمد میاںؒ	436	180روپے
۵-	سیاسی واقتصادی مسائل	مولانا سید محمد میاںؒ	240	120روپے
۶-	حیات شیخ الاسلامؒ	مولانا سید محمد میاںؒ	224	120روپے
۷-	جمعیۃ علماء کیا ہے	مولانا سید محمد میاںؒ	376	160روپے
۸-	پانی پت اور بزرگان پانی پت	مولانا سید محمد میاںؒ	352	160روپے
۹-	دین کامل	مولانا سید محمد میاںؒ	128	60روپے
۱۰-	آنے والے انقلاب کی تصویر	مولانا سید محمد میاںؒ	72	25روپے
۱۱-	طریقہ تعلیم	مولانا سید محمد میاںؒ	120	60روپے
۱۲-	اسلامی زندگی	مولانا سید محمد میاںؒ	130	60روپے
۱۳-	علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے	مولانا سید محمد میاںؒ	766	300روپے
۱۴-	علماء ہند کا شاندار ماضی	مولانا سید محمد میاںؒ	1044	400روپے
۱۵-	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (ایک سیاسی مطالعہ)	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	500	200روپے
۱۶-	اسلامی جہاد اور موجودہ جنگیں	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	80	50روپے
۱۷-	حضرت مفتی کفایت اللہ (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر سلمان شاہجہانپوری	436	180روپے
۱۸-	بزرگان دیوبند اور جہاد شاملی	ڈاکٹر سلمان شاہجہانپوری	296	150روپے
۱۹-	جنگ سیرۃ نبوی کی روشنی میں	مولانا غلام غوث ہزارویؒ	264	130روپے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۰-	انسانی حقوق	محمد رحیم حقانی	128	50روپے
۲۱-	مفتی محمود ایک قومی رہنما	محمد فاروق قریشی	264	130روپے
۲۲-	مولانا علی میاںؒ	محمد فاروق قریشی	270	130روپے
۲۳-	عہد ساز قیادت	ڈاکٹر احمد حسین کمال	234	120روپے
۲۴-	ضربِ درویش	محمد ریاض درانی	450	180روپے
۲۵-	دار العلوم دیوبند (تحفظ و احیاءِ اسلام کی عالمگیر تحریک)	محمد ریاض درانی	130	70روپے
۲۶-	کاروانِ دیوبند (خدمات دیوبند کانفرنس پشاور)	محمد ریاض درانی	500	200روپے
۲۷-	تفسیر محمود (تین جلد مکمل)	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	1600	1000روپے
۲۸-	فتاویٰ مفتی محمود جلد اول	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	670	250روپے
۲۹-	جلد دوم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	528	200روپے
۳۰-	جلد سوم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	576	200روپے
۳۱-	جلد چہارم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	720	250روپے
۳۲-	جلد پنجم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	600	200روپے
۳۳-	جلد ششم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	624	250روپے
۳۴-	جلد ہفتم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	600	200روپے
۳۵-	جلد ہشتم	مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ	480	200روپے
۳۶-	طہارت کے جدید مسائل	مفتی محمد ابراہیم [illegible]	320	150روپے
۳۷-	اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول	علامہ محمد اسد	160	110روپے
۳۸-	تاریخ و تذکرہ خانقاہ سراجیہ	محمد نذیر رانجھا	555	250روپے
۳۹-	شرح دیباچہ مثنوی مولانا روم	محمد نذیر رانجھا	150	110روپے
۴۰-	تذکرہ شیخ ابوالحسن خرقانیؒ	محمد نذیر رانجھا	256	140روپے
۴۱-	خانقاہ احمدیہ سعیدیہ موسیٰ زئی شریف	محمد نذیر رانجھا	704	300روپے
۴۲-	تاریخ و تذکرہ خانقاہ مظہریہ دہلی	محمد نذیر رانجھا	450	200روپے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۳۔	تفسیر چرخی (مولانا یعقوب چرخی)	مترجم محمد نذیر رانجھا	408	250 روپے
۴۴۔	منتخب الافکار شرح طحاوی (چار جلدیں)	مولانا سید ارشد مدنی		1000 روپے
۴۵۔	تلاشِ علم	شیخ عبدالفتاح ابو غدہ ترجمہ مولانا محمد شریف ہزاروی	354	160 روپے
۴۶۔	اسرائیل کیوں تسلیم کیا جائے؟	مولانا محمد شریف ہزاروی	256	130 روپے
۴۷۔	عصر حاضر احادیث کی روشنی میں	مولانا محمد یوسف لدھیانوی تحقیق مولانا محمد شریف ہزاری	400	200 روپے
۴۸	مسئلہ عورت کی امامت کا	مولانا محمد شریف ہزاروی	300	160 روپے
۴۹۔	درویش سیاست دان (مفتی محمود)	محمد انور قدوائی	200	120 روپے
۵۰۔	علماء دیوبند اور مشائخ پنجاب	مولانا محمد عبداللہ	80	25 روپے
۵۱۔	بارگاہِ رسالت اور علماء دیوبند	مولانا محمد عبداللہ	52	12 روپے
۵۲۔	جوہر تقویم	ضیاء الدین لاہوری	312	150 روپے
۵۳۔	خودنوشت افکارِ سرسید	ضیاء الدین لاہوری	272	150 روپے
۵۴۔	خودنوشت حیاتِ سرسید	ضیاء الدین لاہوری	374	200 روپے
۵۵۔	سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی	ضیاء الدین لاہوری	120	70 روپے
۵۶۔	نقش سرسید	ضیاء الدین لاہوری	380	200 روپے
۵۷۔	مولانا عبیداللہ انور (ایک مطالعہ)	پروفیسر امجد علی شاکر	246	150 روپے
۵۸۔	جمعیۃ علماء اسلام کے اغراض ومقاصد	مولانا محمد شریف ہزاروی	180	150 روپے

جمعیۃ پبلی کیشنز متصل مسجد ہائی سکول وحدت روڈ لاہور فون: 5427901-2

www.KitaboSunnat.com
المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹۔۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر 15872

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ISBN 969-8793-58-5

جمعیۃ پبلیکیشنز